سیّد انصر کی غزلیات کا فکری جائزہ

نبیلہ منظور

رول نمبر: 20103026-015

سیشن: خزاں 2020 تا بہار 2022 ء

ایم ایس اردو

شعبہ اردو

فیکلٹی آف ہیومینٹیز اینڈ سوشل سائنسز

یونیورسٹی آف سیالکوٹ، سیالکوٹ

اگست 2022ء

مقالہ ایم ایس اردو

نبیلہ منظور

خزاں 2020تا بہار 2022ء

سیّد انصر کی غزلیات کا فکری جائزہ

مقالہ نگار

نبیلہ منظور

ایم ایس سکالر

رول نمبر: 20103026-015

نگران مقالہ

ڈاکٹر محمد یوسف اعوان

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو

یونیورسٹی آف سیالکوٹ

ایم ایس اردو

شعبہ اردو

فیکلٹی آف ہیومینٹیز اینڈ سوشل سائنسز

یونیورسٹی آف سیالکوٹ، سیالکوٹ

اگست 2022ء

یہ مقالہ ایم ایس اُردو کی جزوی تکمیل اور حصول سند کے لیے
شعبہ اردو فیکلٹی آف ہیومینٹیز اینڈ سوشل سائنسز میں جمع کرایا گیا ہے۔

ریسرچ اسکالر

نبیلہ منظور
ریسرچ سکالر (ایم ایس اردو)
رول نمبر:20103026-015
یونیورسٹی آف سیالکوٹ، سیالکوٹ

نگران مقالہ

ڈاکٹر محمد یوسف اعوان
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو
یونیورسٹی آف سیالکوٹ، سیالکوٹ

تصدیق برائے تکمیل مقالہ

میں تصدیق کرتا ہوں کہ **نبیلہ منظور** رجسٹریشن نمبر 20104884 نے مقالہ بعنوان:

سیّد انصر کی غزلیات کا فکری جائزہ

برائے حصول سند ایم ایس (اردو) میری نگرانی میں شعبہ اردو، فیکلٹی آف ہیومینٹیز اینڈ سوشل سائنسز میں مکمل کیا ہے۔ یہ مقالہ محنت سے لکھا گیا ہے۔ میں اس تحقیقی کام سے مطمئن ہوں۔ میرے خیال میں یہ مقالہ برائے جانچ اور زبانی امتحان کے لیے ڈائریکٹر BASR یونیورسٹی آف سیالکوٹ، سیالکوٹ کو بھیجا جا سکتا ہے تا کہ وہ اس پر مزید کارروائی کر سکیں۔

نگران مقالہ

ڈاکٹر محمد یوسف اعوان
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو
یونیورسٹی آف سیالکوٹ، سیالکوٹ

تصدیق نامہ بابت سرقہ نویسی

میں تصدیق کرتی ہوں کہ **"سیّد انصر کی غزلیات کا فکری جائزہ"** کے عنوان سے مقالہ میں پیش کردہ تحقیقی کام میرا اپنا تحقیقی کام ہے۔میں سرقہ کے خلاف HEC اور یونیورسٹی آف سیالکوٹ کی پالیسی کو سمجھتی ہوں۔ لہٰذا، میں مذکورہ مقالہ کی مصنفہ کی حیثیت سے تصدیق کرتی ہوں کہ میرے مقالہ کا کوئی بھی حصہ کہیں سے سرقہ نہیں کیا گیا اور حوالہ کے طور پر استعمال ہونے والے مواد کا صحیح حوالہ دیا گیا ہے۔

میں اقرار کرتی ہوں کہ اگر میں ایم ایس کی ڈگری لینے کے بعد بھی مذکورہ عنوان کے مقالہ میں کسی رسمی سرقہ کی مرتکب پائی گئی تو یونیورسٹی میری ایم ایس کی ڈگری کو واپس لینے / منسوخ کرنے کا حق محفوظ رکھتی ہے۔HEC اور یونیورسٹی کو جس ویب سائٹ پر ان طلباء کے نام رکھے گئے ہیں جنھوں نے سرقہ شدہ مقالہ جمع کرایا، اس پر میرا نام شائع کرنے کا حق حاصل ہے۔

نبیلہ منظور

ریسرچ سکالر (ایم ایس اردو)

رول نمبر: 20103026-015

یونیورسٹی آف سیالکوٹ، سیالکوٹ

حتمی منظوری

زیر نظر مقالہ بعنوان" **سیّد انصر کی غزلیات کا فکری جائزہ**"

از نبیلہ منظور رول نمبر: 20103026-015

برائے حصول سند ایم ایس (اردو) ہر لحاظ سے مکمل اور ایم ایس کے معیار کے مطابق ہے۔ ہم اس کے انداز تحریر و تحقیق و نتائج سے مطمئن ہیں اور سفارش کرتے ہیں کہ اسکالر کو ڈگری جاری کی جائے۔

بیرونی ممتحن :

نگران مقالہ : ڈاکٹر محمد یوسف اعوان اسسٹنٹ پروفیسر، یونیورسٹی آف سیالکوٹ

صدر شعبہ اردو : ڈاکٹر مشتاق احمد امتیاز ایسوسی ایٹ پروفیسر، یونیورسٹی آف سیالکوٹ

انتساب

پیارے والدین محترم محمد منظور

اور

محترمہ شہناز بیگم کے نام

پیش لفظ

خدائے رب ذوالجلال کی میں بے حد مشکور ہوں جس نے مجھے قوت بصارت و بصیرت عطا کی اور درود وسلام کائنات کی اس ہستی پر جو وجہ تخلیقِ کائنات ہیں۔

میں سید انصر حسین شاہ صاحب کی بے حد ممنون ہوں جنہوں نے مجھے مقالہ تحریر کرنے کے لئے ہر طرح کی رہنمائی اور مواد مہیا کیا۔ میں اپنا یہ مقالہ تحریر کرنے میں ان کی احسان مند رہوں گی کیونکہ ان کی معاونت کے بغیر مقالہ کی تکمیل ناممکن تھی۔

میں بے حد ممنون ہوں صدر شعبہ اردو ڈاکٹر مشتاق احمد امتیاز صاحب، ڈاکٹر عامر اقبال صدیقی صاحب، ڈاکٹر عبدالستار نیازی صاحب، ڈاکٹر قیصر آفتاب صاحب، ڈاکٹر یاسمین کوثر صاحبہ اور میڈم ماریہ صاحبہ کی اور سب سے زیادہ سپاس گزار ہوں اپنے نگران مقالہ ڈاکٹر محمد یوسف اعوان صاحب کی جنہوں نے مقالہ کی تکمیل کے لئے میری رہنمائی کی اور ہر قدم پر میری اصلاح کی۔ ان کی شفقت اور محبت سے میری حوصلہ افزائی ہوئی جس کی بدولت میرا مقالہ پایا تکمیل تک پہنچ سکا۔

اپنے والدین محمد منظور اور شہناز بیگم، شریک حیات نوید اقبال اور خاندان کے ان افراد کی بے حد احسان مند ہوں جن کی دعاؤں اور تعاون سے میرے مقالہ کی تحریر میں ہر آنے والی مشکل دور ہو گئی۔

محترم عمر فاروق، محترم عادل بادشاہ اور خصوصی طور پر محترم عثمان صاحب کی میں بے حد ممنون ہوں جنہوں نے مقالہ نگاری کے دوران جب بھی مجھے ضرورت پڑی اپنا قیمتی وقت دیا اپنی کتب اپنی آراء اور ہر طرح کی بنیادی معلومات فراہم کیں۔ بلاشبہ ان کی معاونت کے بغیر مقالہ کی بروقت تکمیل ممکن نہ ہوتی۔

آخر میں ان تمام شخصیات کی دل سے سپاس گزار ہوں جنہوں نے میرے مقالہ کی تکمیل میں میرے ساتھ تعاون کیا اور میرے حوصلے کو پست ہونے سے بچایا۔ میں اپنے دوست احباب بالخصوص فاطمہ اور شیزہ، اپنے اسکول کے عملہ، اپنے سینئرز اور اپنے ہم جماعتوں کی بے حد ممنون ہوں جنہوں نے مقالہ نگاری کے دوران میری حوصلہ افزائی کی اور میرا ساتھ دیا۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔ (آمین)

نبیلہ منظور

Abstract

Sayyed Anser was born on April 10, 1969 in a scholarly and literary Sadat family in Sarai Alamgir, Gujrat. After graduation, he joined the field of pharmacy for his livelihood and is still serving in this field. He had a literary taste since his childhood so he used to participate as an audience in the poetry and speech gatherings held in his area and also tried his skills in poetry.

In 1997, he formally started poetry by presenting his words for the first time in the monthly poetry session of the well-known literary organization "Adara Adab Afroz" at Al-markaz Hall, Jhelum. He has been serving as the President of Gujrat's famous literary organization "Karwan-e-Adab" for thirty one years. Two of his poetry collections "Dastras" (2000) and "Barson Baad" (2006) have been published respectively while his third poetry collection is under publication with the name of "Ta'ajub".

Themes of Sufism, Karbala, love, plight of the downtrodden labor class and social consciousness are found in his poetry. He has presented Pakistan not only in different cities of Pakistan but also in foreign countries such as Hong Kong "Bazm-e-Sukhan Mushairah", Dubai "Adab Nama" and "Subrang Glassgow" Scotland. His literary work requires that readers should be introduced to his personality and thoughts. His literary position and status should be determined by critically evaluating his intellectual efforts in the the field of Ghazal.

فہرست ابواب

باب اوّل

سیّد انصر احوال و آثار

سیّد انصر کا شمار 90 کی دہائی میں سامنے آنے والے جدید شعرا میں ہوتا ہے۔ عرصہ بیس سال سے معروف ادبی تنظیم "کاروان ادب" کے صدر کی حیثیت سے ادبی خدمات میں مصروف عمل ہیں۔ اس تنظیم کے ذریعے ملکی سطح پر لاتعداد مشاعرے کرائے اور نئے آنے والے شعرا کی حوصلہ افزائی کی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک شاعر کی حیثیت سے بیرون ممالک میں بھی پاکستان کی نمائندگی کر چکے ہیں۔ ان کا تعلق سادات ترمذی خانوادے سے ہے۔ ان کا شجرہ نسب پانچویں لڑی کے بعد چھٹے امام جعفر صادق سے جا ملتا ہے۔ ان کے آباؤ اجداد جب مغل بادشاہ شاہ جہاں کے دور میں وسطی ایشیا برصغیر سے ہجرت کر کے پاکستان پہنچے تو سرائے عالمگیر کے مضافات میں قصبہ کڑیالی کے ایک گاؤں قاضی باقر سیّداں میں آباد ہوئے۔ جہاں ان کی آنے والی نسل نے پروش پائی اور اس سرزمین پر مستقل سکونت اختیار کرلی۔ یہ زمین انہیں شاہ جہاں سے بطور تحفہ ملی تھی۔ اس گاؤں میں صرف سادات خاندان آباد ہے ۔ اسی مناسبت سے اس گاؤں کا نام قاضی باقر سیّداں ہے۔ اس گاؤں میں ایک دربار ہے جو "دربار عالیہ مائی صاحبہ" کے نام سے مشہور ہے۔

سیّد انصر کے خاندان میں ایک مشہور معزز بزرگ بی بی صاحبہ گزری ہیں جو پاک دامن تھیں۔ یہ دربار انہی سے منسوب ہے۔ ان کو مائی صاحبہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مائی صاحبہ کے بارے میں روایت ہے کہ ان کی کرامت اور پاکدامنی کو اورنگزیب بادشاہ نے بھی قبول کیا تھا اور گواہی دی تھی کہ وہ پاکدامن ہیں۔ انہی کی کرامت اور سچائی سے خوش ہو کر بادشاہ نے انہیں زمین تحفہ کے طور پر دے دی۔ اس کرامت کی جانچ کرنے کے لیے انہوں جنت سے سیب لانے کی شرط رکھی کہ جو جنت کا سیب لا کر پیش کرے گا وہ سچا سیّد ہو گا جو یہ شرط پوری نہ کر سکا اس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔ بی بی صاحبہ نے یہ شرط پوری کر دی جس سے خوش ہو کر انہوں نے نہ صرف ان کا نام اصل سیدوں میں لکھا بلکہ انہیں مستقل طور پر رہنے کے لیے یہ زمین بھی تحفہ کے طور پر پیش کی۔ مائی صاحبہ نے شادی نہیں کی تھی وہ زیادہ تر خدا کی عبادت میں مشغول رہتی تھیں۔ ان کی وفات پر گاؤں میں ان کے نام سے دربار بنا دیا گیا۔ اس دربار پر ہر سال بہت بڑا عرس منعقد کیا

جاتا ہے۔ جس میں آس پاس کے تمام گاؤں شرکت کرتے ہیں۔ اس میں سب لوگوں کو کھانا تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس عرس کا سارا انتظام سیّد انصر کا خاندان کرتا ہے۔

خاندانی پسِ منظر:

سیّد اکبر شاہ (دادا) نے اسی گاؤں قاضی باقر سیّد اں میں جنم لیا اور وہیں پلے بڑھے۔ سیّد اکبر شاہ نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی حاکم بی بی تھیں۔ جن سے دو بیٹے اور دو بیٹیوں نے جنم لیا یعنی سیّد اکبر شاہ کے پہلی بیگم سے چار بچے پیدا ہوئے۔ دوسری بیوی سید بیگم ہیں۔ جن کے چھ بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں یعنی نو بچے دوسری بیگم سے پیدا ہوئے۔ اس طرح اکبر شاہ کے تیرہ بچے تھے۔ دونوں بیویاں علیحدہ گھروں میں رہتی تھیں۔ اکبر شاہ کی دوسری بیوی سید بیگم سے پہلے بیٹے کے دو سال بعد 1936ء میں دوسرے بیٹے نے جنم لیا۔ جس کا نام سیّد ریاست حسین شاہ تھا۔ سیّد ریاست حسین شاہ نے بڑے ہو کر مویشیوں کا کاروبار کیا۔ جس سے وہ "سائیں شاہ" کے نام سے مشہور ہوئے۔ اس بارے میں ان کی بہن بشیر فاطمہ کا کہنا ہے:

> "چھوٹی عمر میں مویشیوں کا کاروبار شروع کیا اور تا دم آخر اسی کاروبار میں مشغول رہے۔ بھائی صاحب اپنی شرافت اور دیانت داری کی وجہ سے اپنے علاقے کے علاوہ کشمیر، پنجاب، کراچی اور پشاور تک معتبر شخصیت کے طور پر مانے جاتے تھے۔(1)"

سب بھائیوں میں صرف سیّد ریاست حسین شاہ نے ہی اپنے بل بوتے پر کاروبار کا آغاز کیا تھا۔ اس لیے وہ کاروبار میں خود انحصار تھے۔ ان کی شادی خاندان میں ہی سیّدہ ذکیہ بی بی سے ہوئی۔ سیّد ریاست حسین شاہ اور سیّدہ ذکیہ بی بی کے چار بچے ہیں جن میں تین بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ سب سے بڑے بیٹے سیّد انصر حسین شاہ، دوسرے نمبر پر سیّدہ فردوس کوثر، تیسرے نمبر پر سیّد نزاکت حسین شاہ اور چوتھے نمبر پر سیّد پھلپیر حسین شاہ ہیں یعنی سیّد انصر حسین شاہ کی ایک بہن اور دو بھائی ہیں۔ دونوں بھائی سیّد انصر کے ساتھ ہی سرائے عالمگیر میں رہتے ہیں جن میں سیّد نزاکت حسین شاہ کاروبار اور گھر میں ساتھ رہتے ہیں جبکہ سیّد پھلپیر حسین شاہ خانگی اور کاروباری زندگی میں ان سے الگ ہیں۔ تینوں بھائی سرائے عالمگیر میں ہی مقیم ہیں جبکہ سیّدہ فردوس کوثر کی شادی خاندان میں اپنے آبائی گاؤں قاضی باقر میں ہوئی تھی اس لیے وہ اپنے خاندان کے ساتھ اسی گاؤں میں مقیم ہیں۔

پیدائش:

سیّد انصر حسین شاہ نے 10 اپریل 1969ء کو صوبہ پنجاب (پاکستان) کے ضلع گجرات کی تحصیل سرائے عالمگیر کے قصبہ کڑیالی کے ایک گاؤں قاضی باقر سیّداں کے ایک علمی و ادبی سادات گھرانے میں آنکھ کھولی۔ بعد ازاں 1984ء میں شہر سرائے عالمگیر میں اپنا گھر تعمیر کیا اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ان کو اپنے گاؤں سے بھی شدید محبت ہے اس لیے مستقل بنیادوں پر گاؤں سے تعلق قائم ہے۔ سیّد انصر شاہ کا نام ان کے چچا ثقلین شاہ' دو پھوپھیوں بشیر فاطمہ اور صغیرہ بیگم نے باہمی مشورے سے رکھا۔ اس بارے میں ان کی پھوپھی بشیر فاطمہ کا کہنا ہے:

> "جب بھائی کے ہاں پیارے سے بیٹے نے جنم لیا تو ہم سب بہت خوش تھے سب کی
> دلی تمنا تھی کہ اسی کے بتائے ہوئے نام کو پسندیدگی کی سند ملے۔ اس طرح ہم
> تینوں بہن بھائیوں نے مشاورت سے سیّد انصر کا انتخاب کیا۔" (2)

ان کا نام ان کے ایک چچا اور دو پھوپھیوں نے رکھا۔ ان بزرگوں سے محبت و شفقت کی وجہ سے انہیں اپنا یہ نام بہت پسند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے نام "سیّد انصر حسین شاہ" کو مختصر کرتے ہوئے "سیّد انصر" تخلص استعمال کیا۔

عادات و خصائل:

کچھ بچوں کا بچپن شرارتوں سے بھرپور ہوتا ہے لیکن سیّد انصر بچپن سے ہی سنجیدہ مزاج اور سلجھے ہوئے انسان تھے۔ والدین کی پہلی اولاد ہیں لیکن علمی و ادبی گھرانہ ہونے کی وجہ سے وہ بگاڑ کا شکار نہیں ہوئے۔ ان کی پرورش نہایت ہی ادبی ماحول میں ہوئی۔ ان کے والد صاحب کاروباری سلسلے میں زیادہ تر شہر سے باہر رہتے تھے لیکن ان کی دلی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا پڑھ لکھ کر اچھا انسان بنے۔ گھر میں والدین کے ساتھ ساتھ چچا اور پھوپھیوں کی محبت و شفقت سے ان کی پرورش ہوئی۔ والد کے کاروباری سلسلے میں زیادہ تر گھر سے باہر رہنے کی وجہ سے چچا ثقلین شاہ اور پھوپھیوں کے بہت قریب رہے۔ مشترکہ خاندانی نظام میں پروان چڑھنے کی وجہ سے ان کو شفقت بھرا ماحول ملا۔ والدین اور باقی بزرگوں نے ان کو اعلیٰ اخلاقیات سکھائیں۔ جن میں بڑوں کی عزت کرنا، سچ بولنا، جھوٹ سے نفرت کرنا، چوری چکاری اور لڑائی جھگڑے سے بچنا وغیرہ

شامل ہے۔ والدین خود بھی صوم و صلوٰۃ کے پابند رہے اور بچوں کو بھی اس کی ترغیب دیتے رہے جس سے بچوں میں اچھی عادات پختہ ہو گئیں۔ سیّد انصر کا کہنا ہے:

"جب میں چھوٹا تھا میرے والدین اور پھوپھیوں نے مجھے سکھایا کہ جھوٹ نہیں بولنا، چوری نہیں کرنی، بڑوں کی عزت کرو، چھوٹوں سے پیار کرو۔ اس طرح کے اخلاقی سبق وہ مجھے سکھاتے رہتے تھے۔ نماز پڑھنا اور سچ بولنا بچپن میں ہی والدین نے سکھا دیا تھا۔ گھر بھر میں پہلی اولاد اور لاڈلا ہونے کی وجہ سے سب کی توجہ کا مرکز بنا رہتا اور ہر کوئی مجھے اخلاقیات سکھانے میں لگا رہتا۔" (3)

والدین اور گھر کے دوسرے بزرگوں نے ان کو اخلاقیات سکھائیں۔ گھر کا ماحول دینی ہونے کی وجہ سے ان کا دین سے لگاؤ فطری بات ہے اور صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں۔ ان میں ملنساری اور مہمان نوازی بھی پائی جاتی ہے۔ دوسروں سے بہت خوش اخلاقی سے پیش آتے ہیں اپنا ہو یا پرایا سب سے خندہ پیشانی سے ملتے ہیں۔ وہ سادہ مزاج ہیں اور سادگی پسند کرتے ہیں۔ اعلی اخلاقی اقدار ان کی زندگی میں رچی بسی ہیں اور یہ ان کی طبیعت کا خاصہ ہیں۔

تعلیم:

جس طرح دوسرے بچوں کی اولین درسگاہ ان کا اپنا گھر ہوتا ہے اسی طرح سید انصر کی ابتدائی تعلیم کا آغاز بھی گھر سے ہوا۔ گھر میں چونکہ دینی و مذہبی ماحول تھا لہذا والدین کے علاوہ دونوں پھوپھیوں بشیر فاطمہ اور صغیرہ بیگم نے ان کی دینی تعلیم پر خصوصی توجہ دی۔ جب انہوں نے بولنا شروع کیا تو ان کی پھوپھیوں نے انہیں کلمے اور دعائیں یاد کروائیں۔ یسرنا القرآن قاعدہ پڑھایا۔ اس کے بعد باقاعدہ تعلیم کے لیے قریبی مسجد میں چلے گئے۔ یہاں پر ایک نابینا حافظ اور ان کے قریبی ساتھی منظور شاہ بچوں کو قران پاک کی تعلیم دیتے تھے۔ وہ بھی ان کے پاس دینی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ کچھ عرصہ ان کے پاس ناظرہ قرآن پڑھا اور بعد میں حافظ شاہ کے بیٹے یونس شاہ سے قرآن پاک کی باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے لگے۔ حافظ فاضل شاہ نے (جو پہلے انگلینڈ میں مقیم تھے) واپس آکر گاؤں کی قریبی مسجد میں پڑھانا شروع کیا۔ محلے کے بچے ان کے پاس قرآن پاک پڑھنے لگے جن میں سیّد انصر بھی شامل تھے۔ اس طرح انہوں نے حافظ فاضل شاہ سے تجوید کے ساتھ ناظرہ قرآن پاک مکمل کیا۔ یہ دینی تعلیم گھر میں بھی جاری رہی۔ دونوں پھوپھیاں ان سے قرآن پاک سنتیں اور ان کی مزید اصلاح کرتیں۔

انہوں نے سکول کی تعلیم بھی گھر سے شروع کی۔ ابتدائی قاعدہ گھر پر ہی پھوپھیوں کے پاس پڑھا۔ پانچ سال کی عمر میں انہیں جماعت اول میں گورنمنٹ پرائمری سکول قاضی باقر میں داخل کروادیا گیا۔ پانچ سال اسی سکول میں پڑھتے رہے اور جماعت پنجم کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ چونکہ گاؤں میں پرائمری سکول تھا لہٰذا ان کو جماعت ششم میں داخلہ کے لیے ساتھ والے قصبہ کڑیالی میں جانا پڑا۔ گورنمنٹ ماڈل سکول کڑیالی میں تین سال تک زیر تعلیم رہے اور مڈل کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ انہوں نے جماعت نہم میں داخلہ کے لئے سرائے عالمگیر کا رخ کیا۔ اس دوران والدین نے مستقل طور پر شہر میں رہنے کا ارادہ کیا اور سرائے عالمگیر میں اپنا گھر بنانا شروع کر دیا۔ سیّد انصر نے 1982ء میں جماعت نہم میں گورنمنٹ ہائی سکول سرائے عالمگیر میں داخلہ لیا۔ وہاں انہیں اردو کے بہترین استاد ملے۔ پندرہ سال کی عمر میں میٹرک کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ اسی سال انہوں نے ایف اے میں گورنمنٹ انٹر کالج جہلم میں داخلہ لیا۔ وہاں انہیں اردو کے بہترین استاد عبدالباری عباسی ملے جن کے بارے میں سیّد انصر بتاتے ہیں:

"میرے استاد عبدالباری عباسی بھارت سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔ رشتے میں وہ جگر مرادآبادی کے بھانجے تھے۔ عبدالباری صاحب خود بھی افسانہ نگار تھے اور اردو کے بہت اچھے استاد تھے۔ اگر وہ مجھے نہ ملتے تو شاید میں شاعر نہ بن پاتا۔ وہ کوئی بھی لفظ پڑھتے تو اس کا معنی اور تلفظ سمجھاتے۔ میری اردو عبدالباری صاحب کی وجہ سے بہت اچھی ہوتی گئی اور میری لغت میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ شعروں کی تشریح اتنے اچھے انداز میں کرتے کہ سب فوراً سمجھ میں آ جاتا۔" (4)

انہوں نے اس کالج سے 1986ء میں ایف اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ بی اے میں داخلہ کے لیے گورنمنٹ ڈگری کالج جہلم کا رخ کیا اور 1988ء میں بی اے کا امتحان سیکنڈ ڈویژن سے پاس کیا۔ کاروباری اور گھریلو مسائل کی وجہ سے مزید تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور بی اے کے بعد تعلیم کو ادھورا چھوڑنا پڑا۔ اس کے فوراً بعد اسی سال ڈسپنسری کی تعلیم حاصل کی اور وہیں سے اپنے کاروبار کا آغاز کیا۔

عملی زندگی:

مشترکہ خاندانی نظام کی وجہ سے چچا ثقلین شاہ گھر کے سربراہ تھے اور ان کو کاروبار کے لیے ادویات کا شعبہ پسند تھا۔ سیّد انصر چونکہ گھر کے بڑے بیٹے تھے لہٰذا انہیں بھی کاروبار کی طرف آنے کی

ترغیب دی گئی۔ چچا کی ترغیب پر انہوں نے 1989ء میں عزیز بھٹی ہسپتال گجرات سے ڈسپنسر کا ڈپلومہ حاصل کیا۔ کچھ عرصہ اپنے دوست کے ساتھ میڈیکل سٹور پر کام کیا اور کاروباری تجربہ حاصل کیا۔ اس دوران خاندانی کاروبار کے لیے مارکیٹ کی تعمیر بھی جاری تھی جو پچاس دکانوں پر مشتمل تھی۔ سادات مارکیٹ کے نام سے اب بھی یہ مارکیٹ سرائے عالمگیر میں موجود ہے۔ انہوں نے اسی مارکیٹ میں 1992ء میں "انصر میڈیکوز" کے نام سے ایک فارمیسی بنائی اور اپنے کاروبار کا آغاز کیا۔ وہ آج بھی اسی کاروبار سے منسلک ہیں اور یہ ان کے لیے بہترین ذریعہ معاش ہے۔

عائلی زندگی:

انسان کو ایک نہ ایک دن شادی جیسے خوبصورت بندھن میں بندھنا ہوتا ہے کیونکہ یہ بھی زندگی کا ایک حصہ ہے۔ جب سیّد انصر تیئیس سال کے ہوئے تو والدین نے ان کی شادی کا فیصلہ کیا۔ اس طرح 1992ء میں ان کی شادی چچا شوکت کی بڑی بیٹی سیّدہ تسلیم ظاہرہ سے ہوئی جو ان سے چھ سال چھوٹی ہیں۔ گھر کے بزرگوں نے ان کی نسبت بچپن سے ہی چچی زاد ظاہرہ سے طے کر رکھی تھی جس کی لاج رکھتے ہوئے دونوں بخوشی رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ مشترکہ خاندانی نظام کی وجہ سے سب ایک ہی گھر میں مقیم تھے لہٰذا چچا کے گھر پہلی اولاد ہونے پر سیّد انصر نے ان کا نام تسلیم ظاہرہ رکھا۔ یہی تسلیم ظاہرہ بڑی ہو کر ان کی شریک حیات بنیں۔ سیّد انصر بتاتے ہیں:

> "جب چچا شوکت کی شادی ہوئی تب میں چار سال کا تھا۔ 11 فروری 1975ء کو جب میں چھ سال کا تھا چچا کے گھر ایک ننھی سی پری نے جنم لیا۔ مجھے وہ ننھی پری بہت پیاری لگی۔ میں نے اس گڑیا کا نام تسلیم ظاہرہ رکھا۔ سب کو یہ نام بہت پسند آیا" (5)

دونوں میاں بیوی میں بے حد محبت ہے۔ ان کی بیوی تسلیم ظاہرہ بھی اس خوبصورت بندھن میں بہت خوش ہیں۔ ان کو اپنے محبوب شوہر کا خیال رکھنا اور ہر قدم پر ان کا ساتھ دینا بہت پسند ہے۔ وہ ایک اچھی شریک حیات ہیں۔ وہ کبھی کبھار اپنے شوہر کی مصروفیات سے رنجیدہ بھی ہو جاتی ہیں لیکن یہ رنجیدگی کبھی ان کے رشتہ میں دراڑ پیدا نہیں کر سکی۔ ان کو اپنا یہ چچازاد بچپن سے ہی بہت پسند تھا۔ وہ ان کی سنجیدہ مزاجی اور خوش اخلاقی سے بہت متاثر تھیں۔ سیّدہ تسلیم ظاہرہ اپنے شوہر کے مزاج کے بارے میں یوں بیان کرتی ہیں:

"سیّد انصر بچپن سے ہی بہت سنجیدہ مزاج اور سب کا خیال رکھنے والے انسان تھے۔ سب گھر والوں کی آنکھ کا تارا تھے۔ مجھے بھی اپنا یہ سنجیدہ مزاج اور خیال رکھنے والا چچازاد بہت پسند تھا" (6)

یوں جوان ہونے پر دونوں کو شادی کے خوبصورت بندھن میں باندھ دیا گیا۔ دونوں ہنسی خوشی محبت بھری زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ اپنے گھر والوں کے لیے بہت شفیق اور مہربان ہیں۔ وہ بہترین شریک حیات ہیں۔ دونوں میں محبت و التفات پایا جاتا ہے جس سے ان کی عائلی زندگی خوشگوار ہے۔ سیّدہ تسلیم ظاہرہ گھریلو خاتون ہیں۔ وہ اپنے شوہر کی شاعری بہت شوق سے سنتی اور سمجھتی ہیں۔ وہ اپنے شریک حیات کے لب و لہجہ کی بھی خاصی پہچان رکھتی ہیں۔ سیّد انصر کا کہنا ہے:

"میں کسی اور شاعر کا شعر سناؤں اور اسے اپنی طرف منسوب کروں تو سیّدہ ظاہرہ فوراً کہہ دیتی ہیں کہ یہ شعر آپ کا نہیں ہے۔"(7)

زندگی میں پسندیدہ ہمسفر کا ساتھ اور ایسا ساتھی جو پیار کرنے والا ہو، زندگی میں خوشیوں کا سبب ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ سیّد انصر اور ان کی زوجہ ایک خوش گوار زندگی بسر کر رہے ہیں کیونکہ دونوں میں باہمی محبت اور عزت و وقار پایا جاتا ہے جو ان کی عائلی زندگی کو مزید خوشنما بناتا ہے۔

اولاد:

سیّد انصر اور ان کی بیوی تسلیم ظاہرہ کو اللہ تعالی نے اپنی نعمتوں اور رحمتوں سے نواز رکھا ہے۔ ان کے سات بچے ہیں جن میں پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ سب بچے سلجھے ہوئے اور فرمانبردار ہیں۔ ان کو والدین سے خصوصی محبت ہے۔ سیّد انصر کو بہت شوق تھا کہ ان کے سب بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں لیکن زیادہ تر بچوں کا رجحان اپنے خاندان کی طرح کاروبار کی طرف تھا لہٰذا کچھ نے تعلیم اور بعض نے کاروبار کا انتخاب کیا۔ ان بچوں کی ترتیب کچھ یوں ہے۔

1۔ سب سے بڑے بیٹے سیّد دل پذیر حسین شاہ ہیں جو سرائے عالمگیر میں پیدا ہوئے۔ وہ 2019ء سے ملائشیا میں مقیم ہیں اور کمپنی میں ملازمت کر رہے ہیں۔

2۔ دوسرے نمبر پر سیّد امیر حمزہ شاہ ہیں جو گریجویشن کر رہے ہیں۔ شاعری سے خصوصی لگاؤ ہے اس لیے بچپن سے والد کے ساتھ مشاعروں میں بھی شرکت کرتے رہتے ہیں۔ وہ خود بھی شاعری کرتے ہیں اور انہوں

نے والد سے شاعری کے اوزان میں بھی مہارت حاصل کرلی ہے۔ ان کی غزل کے تین اشعار درج ذیل ہیں:

بیتے برسوں کی یادوں کے نقش مٹانے آیا ہوں
تجھ کو بھول کے لوٹ رہا ہوں یہ بتلانے آیا ہوں
چاند کے ہمراہ ہم دونوں جب چلتے چلتے دور گئے
ساحل پر ان لمحوں کی تصویر بنانے آیا ہوں
دستک دی تو کہنے لگی تم اب کس کام سے آئے ہو
حمزہ ہنس کر میں نے کہا اک شعر سنانے آیا ہوں(8)

سیّد امیر حمزہ شادی شدہ ہیں۔ ان کی شادی خاندان میں ہی پھوپھی زاد سیّدہ سمیعہ سے ہوئی اور ایک بیٹی ایمان ظاہرہ کے باپ ہیں۔ سیّد امیر حمزہ پڑھائی اور شاعری کے علاوہ کاروبار میں بھی والد کے ساتھ فارمیسی پر کام کرتے ہیں۔

3۔ تیسرے نمبر پر سیّد عادل حسین شاہ ہیں۔ ان کو بھی کاروبار سے لگاؤ ہے۔ وہ 2016ء سے یونان میں مقیم ہیں اور وہیں پر کاروبار کر رہے ہیں۔

4۔ ان کے بعد سیّد عمیر شوکت ہیں جو شعبہ ادویات سے منسلک ہیں اور والد کے ساتھ ہی فارمیسی پر کام کر رہے ہیں۔

5۔ بیٹوں میں سب سے چھوٹے سیّد حسنات شوکت ہیں ان کو بھی پڑھائی سے زیادہ کاروبار میں دلچسپی ہے اسی سلسلہ میں وہ جنوری 2020ء سے دوبئی میں مقیم ہیں۔

6۔ اولاد میں چھٹے نمبر پر اور بیٹیوں میں سب سے بڑی سیّدہ صالحہ انصر ہیں۔ ان کو بھی اپنے آباؤاجداد کی طرح کاروبار سے لگاؤ ہے اس لیے انہوں نے کاروبار کے شعبہ کو ہی اپنایا۔ آئی کام کرنے کے بعد 2022ء میں اکاؤنٹنگ اینڈ فنانس میں ADP کی ڈگری حاصل کی ہے اور مزید بی بی اے (BBA) کرنے کا ارادہ ہے۔

7۔ سب سے چھوٹی اور گھر بھر کی لاڈلی سیّدہ آمنہ انصر ایف ایس سی پری میڈیکل کی طالبہ ہیں اور سٹینڈرڈ کالج سرائے عالمگیر میں میں زیر تعلیم ہیں۔

یہ سب بچے سرائے عالمگیر میں ہی پیدا ہوئے۔ سیّد انصر اپنے بچوں کے ساتھ دوستانہ مزاج رکھتے ہیں اس لیے بچے بلا جھجھک سب معاملات میں والدین سے مشاورت کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے بیٹوں اور بیٹیوں

میں کبھی کوئی فرق روا نہیں رکھا اور ان کی تربیت پر خصوصی توجہ دی ہے۔ سادات ہونے کے باوجود اور خاندانی پابندیوں کے بر خلاف بچیوں کی تعلیم میں کوئی کمی نہیں آنے دی اور انھیں پڑھائی کی مکمل آزادی دے رکھی ہے۔ پراپادھن ہونے کی وجہ سے ان کو اپنی بیٹیوں سے والہانہ محبت ہے۔ ان کی بیٹی صالحہ انصر کا کہنا ہے:

"والد نے کبھی بھی ہم پر بے جا سختی اور روک ٹوک نہیں کی۔ خاندان کی لڑکیاں گھر داری کرتی ہیں لیکن ہمارے والد نے ہمیں بہترین کالجز میں تعلیم دلوائی اور ہمیں پڑھائی کی مکمل آزادی دی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم والدہ سے زیادہ والد کے قریب ہیں۔ ہر بات بلا جھجھک والد صاحب سے کر لیتی ہیں۔ ہمارے والد باپ ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارے دوست بھی ہیں۔ ہمارے والد ہمارا فخر ہیں۔" (9)

یہ ان کی اولاد کے لیے محبت اور شفقت ہے کہ بچیاں والدہ سے زیادہ والد کے قریب ہیں۔ سلجھی ہوئی اور پر اعتماد ہیں۔ تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے ہر کام کر سکتی ہیں۔ انہیں تعلیم حاصل کرنے کی مکمل آزادی ہے۔ بچیاں بھی بہت ملنسار اور پر اعتماد ہیں۔ یہ خصوصیات بچوں میں تب ہی آتی ہیں جب والدین کے آپس میں بہترین تعلقات ہوں اور اولاد پر مکمل اعتماد ہو۔

ادبی زندگی:

اگرچہ خاندان میں زیادہ پڑھنے کا رواج نہیں تھا اور نہ ہی خاندان میں پہلے کوئی شاعر تھا۔ ان کے رزاق چچا ہلکی پھلکی پنجابی مزاحیہ شاعری کرتے تھے لیکن وہ باقاعدہ شاعر نہیں تھے۔ سید انصر کو بچپن سے ہی شاعری سے لگاؤ تھا۔ ان کی اردو زبان سے محبت انہیں شاعر بنانے کا سبب بنی۔ انہیں بچپن سے ہی غزلیں سننا پسند تھا۔ بچپن میں انہوں نے ایک ذاتی ڈائری بنا رکھی تھی جس پر وہ اپنے پسندیدہ اشعار لکھ لیتے اور انہیں فرصت کے اوقات میں پڑھتے رہتے۔ سیّد انصر کا کہنا ہے:

"جب میں تیسری جماعت میں تھا میری لکھائی بہت اچھی تھی جس وجہ سے لوگ مجھ سے خط لکھواتے۔ تب میں نے کاپی کے اوراق پھاڑ کر ایک چھوٹی سی ڈائری بنا رکھی تھی۔ اخبار سے یا کتابوں سے کوئی اچھا شعر ملتا تو اسے ڈائری میں لکھ لیتا اور جو گیت میں سنتا اسے گنگناتا رہتا۔"(10)

ان کو موسیقی سے بھی لگاؤ تھا۔ موسیقی کی دھیمی سی دھن انہیں بہت پسند تھی۔ وہ بچپن میں زیادہ تر ریڈیو پر چلنے والی غزلیں سنتے رہتے۔ وہ غزلیں انہیں اپنی طرف مائل کرتی تھیں۔ پانچویں جماعت تک ان کا میلان شاعری کی طرف رہا لیکن بعد میں یہ شوق پڑھائی کرتے ہوئے دب گیا۔ میٹرک تک ان کی یہ صلاحیت ان سے پوشیدہ رہی۔ جب وہ کالج کی سطح پر آئے تو ایف اے کے پہلے سال میں انہیں اردو کے بہت اچھے استاد عبد الباری عباسی سے پڑھنے کا موقع ملا۔ ان کے شاعرانہ انداز سے سید انصر کے جذبہ شوق کو ایک چنگاری ملی۔ جس سے ان کی پوشیدہ شاعرانہ صلاحیتیں پھر سے اجاگر ہونا شروع ہوئیں۔ سیّد انصر کا کہنا ہے:

> "اگر یہ استاد مجھے نہ ملتے تو شاید میں شاعر نہ بن پاتا اور میری یہ صلاحیت چھپی ہی رہتی۔ ان کے شعروں کی تشریح کرنے کے انداز سے میرے اندر کے شاعر کو ایک چنگاری ملی اور میری پوشیدہ شاعرانہ صلاحیتیں ظاہر ہونے لگیں۔" (11)

انٹر میڈیٹ کے سال اول میں انہوں نے شاعری کی مختلف کتابیں خریدیں۔ جن میں سب سے پہلے مرزا غالب کی "دیوان غالب" خریدی اور لغت کے ساتھ پڑھی۔ اس کے بعد شاعری کی مزید کتابیں خریدیں جن میں ساحر لدھیانوی کی کتاب "تلخیاں" قمر جلالوی کی کتابیں "رشک قمر" ، "اوج قمر" اور میر تقی میر کی مختلف شاعری کی کتابیں شامل تھیں۔ چونکہ ان کو شاعری سے لگاؤ تھا وہ پڑھنے کے لیے بھی شاعری کی کتابوں کا ہی انتخاب کرتے۔ سال دوم کے آخر تک وہ شاعری کی مختلف کتابوں کا مطالعہ کر چکے تھے۔ انہوں نے ان کتابوں کو بہت توجہ اور دل جمعی سے پڑھا۔ جب گریجویشن میں پہنچے تو شاعری سے لگاؤ مزید بڑھا۔ انہوں نے اپنے تسکین شوق کے لیے محسن نقوی کی کتاب "برگ صحرا" لائبریری سے جاری کرائی اور اس کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ ان کے نزدیک "برگ صحرا" شاعری کی بہترین کتابوں میں سے ایک تھی۔ مرزا غالب، میر تقی میر، ساحر لدھیانوی اور محسن نقوی ان کے پسندیدہ شعرا میں شامل ہیں۔ وہ محسن نقوی سے بہت متاثر ہیں۔ سیّد انصر کا محسن نقوی کی کتابوں کے بارے میں کہنا ہے:

> "برگ صحرا" محسن نقوی کی سب کتابوں میں سے بہترین کتاب ہے۔ شاعری کا جو معیار اس کتاب میں ہے وہ کسی اور کتاب میں نہیں۔ برگ صحرا ان کی دوسری کتاب ہے جس کی وجہ سے محسن نقوی کو بہت شہرت ملی۔" (12)

ان شعرا سے متاثر ہوتے ہوئے انہوں نے خود بھی شاعری کرنا شروع کر دی۔ وہ شعر لکھتے، دوستوں کو سناتے اور اسے ڈائری پر لکھ لیتے۔ اس طرح وہ ہلکی پھلکی شاعری کرنے لگے۔ جب وہ گریجویشن میں پہنچے تو

با قاعدہ طور پر شاعری کرنے لگے۔ یہ شاعری گجرات کے ایک رسالہ "جذبہ گجرات" میں شائع ہونے لگی۔ جب وہ 1989ء میں گجرات میں ڈسپنسری کی تعلیم حاصل کر رہے تھے اس دوران وہاں پر کچھ صحافیوں اور شعرا سے ملاقات ہوئی۔ سیّد انصر نے ان شعرا کو اپنا کلام سنایا تو انہوں نے ان کو اوزان سیکھنے کا مشورہ دیا۔ وہ بے وزن شاعری کیا کرتے تھے اس بارے میں سیّد انصر کا کہنا ہے:

> " انہوں نے کہا کہ آپ اچھے شاعر بن سکتے ہیں لیکن آپ کو ایک اچھا استاد لینے کی اشد ضرورت ہے کیونکہ آپ وزن کے ساتھ شعر نہیں کہتے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ مجھے اس فن کو سیکھنا چاہیے اور میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ مجھے شاعری کرنی ہے اور وزن کے ساتھ کرنی ہے۔" (13)

یہاں سے ان کی فنی ریاضت کا سفر شروع ہوتا ہے جو تقریباً دو سال پر محیط ہے۔ انہوں نے شاعری سیکھنے کے لئے ایسے استاد کی تلاش شروع کر دی جو انہیں شاعری کے اوزان سکھا سکے۔ ایف۔اے میں وہ اپنے مطالعہ پاکستان کے استاد ارشد حسین ارشد (جو کہ پنجابی شاعر بھی تھے) کے پاس ٹیوشن پڑھنے ان کے گھر جاتے تھے۔ ارشد حسین صاحب کے پاس ان کے دوست حبیب الرحمن حبیب تشریف لاتے جو ایک بہت اچھے شاعر تھے۔ دونوں دوست مل کر جب شاعری پر گفتگو کرتے تو سیّد انصر ان کی شاعرانہ باتیں غور سے سنتے تھے۔ شاعری کے اوزان سیکھنے کے لیے ان کو اپنے یہ استاد نہایت مناسب لگے۔ وہ اسی سال یعنی 1989ء میں ہی اوزان سیکھنے کے لیے ان کے پاس تشریف لے گئے۔ اس طرح انہوں نے حبیب الرحمن حبیب سے با قاعدہ اوزان کے ساتھ شاعری سیکھنا شروع کر دی۔ استاد صاحب انہیں مختلف طریقوں سے اوزان سکھانے کی کوشش کرتے رہے۔ کبھی پیراگراف کی تقطیع کر کے سکھاتے، کبھی غزل گنگنا کر اور کبھی طبلے کی دھن سے اوزان بتانے کی کوشش کرتے لیکن یہ اوزان سیّد انصر کی سمجھ سے بالاتر تھے۔ ایک رات جب وہ غزلوں کی کتاب پڑھ رہے تھے تو اچانک انہیں اوزان کی سمجھ آگئی۔ اس بارے میں سیّد انصر بتاتے ہیں:

> "میں ایک رات مختلف شعرا کی گائی ہوئی غزلوں پر مشتمل ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ اچانک میں نے ان میں سے ایک غزل کو اسی گلوکار کی گائی ہوئی دھن میں گنگنانا شروع کر دیا۔ جب میں نے اس کی دھن پر غور کیا تب مجھے احساس ہوا کہ جہاں لفظ ختم ہو رہے ہیں وہیں اس کی دھن بھی ختم ہو رہی ہے۔ اس میں ضرور کوئی راز ہے۔ میں نے دوبارہ سے غزل گنگنانا شروع کی اور اسے ایک نیا آہنگ دینے کی کوشش کی لیکن کسی اور دھن میں اس غزل کو گنگنا نہیں سکا۔ پھر میں نے ایک اور

غزل دوسری دھن میں گنگنائی۔ جس سے مجھے اوزان کی سمجھ آگئی تب مجھے معلوم ہوا کہ ہر غزل کا اپنا ایک وزن ہوتا ہے۔ میں نے اس رات اوزان سمجھ آنے کی خوشی میں مکمل اوزان کے ساتھ تین غزلیں لکھ ڈالیں۔ صبح ہونے پر میں نے اپنا کلام استاد کو سنایا تو انہوں نے حیران ہوتے ہوئے مجھے شاباش دی اور کہا اب آپ باقاعدہ اوزان کے ساتھ نہ صرف غزل لکھ سکتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی سکھا سکتے ہیں۔" (14)

اس طرح انہوں نے اوزان کے ساتھ غزلیں لکھنا شروع کر دیں اور المرکز ہال جہلم میں ہونے والی ادبی تنظیم "ادارہ ادب افروز" کی ماہانہ شعری نشست میں پہلی بار اپنا شاعرانہ کلام پیش کیا۔ اب ان کی باوزن شاعری دوبارہ "جذبہ گجرات" سے شائع ہونے لگی۔ اس کے علاوہ ہفت روزہ اخبار "دھواں" سرائے عالمگیر سے بھی ان کی شاعری شائع ہونے لگی۔ ان کی غزلیں لوگ پڑھتے اور اچھے تبصرے دیتے۔ اس طرح ان کی شاعری منظر عام پر آنے لگی۔

ان کی زندگی میں کچھ حالات ایسے بھی آئے کہ انہوں نے شاعری ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ چونکہ ان کی شادی 1992ء میں ہوئی تھی اور اسی سال شادی کے تقریبا ایک ماہ بعد ان کے کاروبار "انصر میڈیکوز" کی شروعات تھی۔ شادی کے اوائل ایام اور کاروبار کے ابتدائی دنوں نے ان کو بہت مصروف کر دیا۔ اس طرح کاروبار اور گھر دونوں طرف خصوصی توجہ کی ضرورت تھی۔ اس ذمہ داری سے ان پر کام کا اضافی بوجھ بڑھ گیا اور شاعری کے لیے وقت نکالنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ انہوں نے ان حالات سے پریشان ہو کر شاعری سے سبکدوش ہونے کو ترجیح دی۔ اس طرح چار سال اسی کشمکش میں گزر گئے۔ پھر اچانک دسمبر 1996ء میں ان کے چچا شوکت صاحب گردہ ناکارہ ہونے کی وجہ سے وفات پا گئے۔ جس کا ان کو بہت صدمہ پہنچا۔ گھر کے سبھی افراد اس غم میں مبتلا تھے کیونکہ تقریباً پچاس سال کی عمر پا کر چچا اچانک ہی خالق حقیقی سے جا ملے۔ وہ چونکہ گھر کے بڑے بیٹے تھے اس وجہ سے چچا شوکت کو ان سے بہت لگاؤ اور پیار تھا۔ وہ ان کی ہر خواہش بخوشی پوری کرتے۔ ان کو بھی اپنے اس چچا سے بہت محبت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انہیں اپنے چچا شوکت شاہ کی وفات کا بہت صدمہ پہنچا اور یہی غم انہیں پھر سے شاعری کی طرف لے آیا۔ سیّد انصر کہتے ہیں:

"چچا کی وفات سے پہلے میں یہ قسم کھانے والا تھا کہ میں اب شاعری نہیں کروں گا لیکن چچا کی وفات نے ایسا صدمہ دیا کہ میں نے یہ قسم کھائی اب میں کبھی شاعری نہیں چھوڑوں گا اور ایک اچھا شاعر بن کر ابھروں گا۔ اس طرح میں نے باقاعدہ

شاعری کرنا شروع کر دی۔ ساتھ ہی ساتھ ایک تنظیم بنائی اور مشاعروں میں جانا
شروع کر دیا۔"(15)

انہوں نے اپنی پہلی کتاب کا انتساب بھی اپنے پیارے چچا شوکت کے نام کیا ہے۔ پھر وہ باقاعدگی سے مشاعروں میں جانے لگے اور شاعری کرنے لگے۔ اس طرح انہوں نے ادبی دنیا میں اپنا مقام بنانا شروع کیا۔

ادبی تنظیم (کاروان ادب) :

شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ادبی تنظیم کے سربراہ بھی ہیں۔ انہوں نے 1997ء میں چند دوستوں کے ساتھ مل کر ایک ادبی تنظیم بنائی جس کا نام "ادب دوست" رکھا گیا. اس تنظیم کا مقصد نئے آنے والے شعرا کو متعارف کرانا اور جدید شاعری کو منظر عام پر لانا تھا۔ انہوں نے اس تنظیم میں بحیثیت نائب صدر اپنی خدمات سر انجام دیں۔ یہ تنظیم کچھ عرصہ تک کام کرتی رہی لیکن پھر چند افراد نے اس تنظیم کے شعرا کو اپنے ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ جس وجہ سے یہ تنظیم دو حصوں میں بٹ گئی۔ سیّد انصر نے چند دوستوں کے ساتھ مل کر ایک الگ تنظیم بنالی۔ جس میں بحیثیت صدر ادبی خدمات سر انجام دینے لگے اور یہ خدمات اب بھی جاری ہیں۔ اس تنظیم کا نام "کاروان ادب" رکھا گیا. یہ تنظیم بہت کامیابی کے ساتھ جدید شعرا کو متعارف کروا رہی ہے۔ اس تنظیم کا صدر دفتر سادات مارکیٹ انصر میڈیکوز کی پہلی منزل پر ہے۔ وہاں پر اکثر شعری نشستیں ہوتی رہتی ہیں۔ اس تنظیم کے تحت بڑے پیمانے پر ہونے والی نشستیں "جناح ہال کالج" کے مرکزی ہال میں منعقد کی جاتی ہیں۔ اس تنظیم کے تحت ہر سال مختلف شہروں میں شعری نشستیں منعقد کی جاتی ہیں۔ جس میں جدید شاعری اور جدید شعرا کو متعارف کروایا جاتا ہے۔

تنظیم کے شعرا:

اس تنظیم کے شعرا میں شاہد ذکی صاحب اور اقبال کوثر سر فہرست ہیں۔ شاہد ذکی کا تعلق سیالکوٹ سے ہے۔ ان کو متعارف کرانے میں سیّد انصر نے جو محنت کی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت کھلے اور شفاف دل کے مالک ہیں۔ وہ دوسرے شعرا کو متعارف کرانے میں بہت شوق سے کام کرتے ہیں۔ شاہد ذکی کی ایک غزل رسالے میں شائع ہوئی جو ان کو بہت پسند آئی۔ اس غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

کہا نہ تھا کہ میں نازک ہوں مت تراش مجھے
یہ کس جنوں میں کیا تو نے پاش پاش مجھے
یہ پیٹ ساتھ نہ ہوتا تو میں فرشتہ تھا

کیا معاش کے چکر میں بدمعاش مجھے
یہ مجھ کو بانٹ کے کچھ وقت کاٹ لیتے
سمجھ رکھا ہے میرے دوستوں نے تاش مجھے(16)

اس غزل نے انہیں بہت متاثر کیا۔ انہوں نے اس غزل کے مصنف شاہد ذکی سے رابطہ کرنے کی جو کاوشیں کیں اس سے ان کی ادبی تنظیم کے لیے محبت اور ریاضت کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے لئے انہوں نے شاہد ذکی صاحب کو خط لکھا جس کا انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ انہی دنوں وہ اپنی کتاب "دسترس" چھپوانے کے لئے الحمد پبلیکیشنز کے دفتر گئے۔ وہاں الحمد پبلیکیشنز کے مالک صفدر حسین سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ شاہد ذکی کی کتاب " خوابوں سے خالی آنکھیں" الحمد پبلیکیشنز نے شائع کی ہے۔ سیّد انصر نے وہاں سے وہ کتاب خریدی اور ان کا فون نمبر بھی لیا۔ گھر آکر ان سے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی اور انہیں تنظیم میں شمولیت کی دعوت دی۔ بعد میں انہوں نے اپنی تنظیم کے کسی فرد کے ذریعے بھی ملاقات کا پیغام بھیجا لیکن وہ مسلسل ٹال مٹول سے کام لیتے رہے۔ ان کے بارہا اصرار پر شاہد ذکی صاحب نے ان کی تنظیم میں شمولیت اختیار کرلی۔ اس طرح انہوں نے اپنی تنظیم کاروان ادب سے ان کو متعارف کرایا۔ ان کے علاوہ یاسمین سحر ' افضل گوہر ' اختر رضا سلیمی ' سعید دوشی علی یاسر، اور ریاض عادل بھی "کاروان ادب" کے پلیٹ فارم سے متعارف ہونے والے شعرا میں شامل ہیں۔ یہ سلسلہ اب بھی بہت کامیابی کے ساتھ جاری و ساری ہے۔

ادبی تخلیقات:

شاعری سے لگاؤ نے سیّد انصر کو ممتاز شاعر بنا دیا۔ ان کی جو شاعری رسائل میں شائع ہوتی تھی اسے باقاعدہ کتابی شکل دے دی گئی اور 2000ء میں ان کی پہلی کتاب "دسترس" کے نام سے شائع ہو کر منظر عام پر آئی جسے ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی حاصل ہوئی۔ اس کے چھ سال بعد ایک اور کتاب "برسوں بعد" 2006ء میں منظر عام پر آنے کے بعد کافی مقبولیت حاصل کرچکی ہے جبکہ تیسرا شعری مجموعہ "تعجب" کے نام سے زیر طبع ہے۔ یہ تینوں مجموعے زیادہ تر غزلیات پر مشتمل ہیں۔ ان میں مختلف قسم کے موضوعات زیر بحث ہیں جن میں تصوف، کربلا، عشق و محبت، پسے ہوئے مزدور طبقے کی زبوں حالی، سیاسی صورتحال اور سماجی شعور کا بیان شامل ہے۔ ان کا طبعی میلان شروع سے ہی غزل کی طرف رہا ہے اس لیے ان کو غزل میں خوب

مہارت حاصل ہے۔ چند نعتیہ اشعار بھی کہے اور نظم میں بھی طبع آزمائی کی لیکن غزل کی طرف زیادہ توجہ رہی اور اسی میں مہارت حاصل کی۔ غزل کے بارے میں سیّد انصر کا کہنا ہے:

"غزل میں اختصار پایا جاتا ہے۔ جو بات فکشن یا نظم میں پوری کہانی کی صورت میں بیان کرنی پڑتی ہے۔ وہی بات غزل کے دو اشعار میں آسانی سے کہی جا سکتی ہے۔" (17)

وہ کم گو اور خاموش طبع انسان ہیں۔ اسی مناسبت سے انہیں اختصار پسند ہے۔ ان کا طبعی میلان ہی اختصار کی طرف ہے۔ عام طور پر شعرا اپنا تخلص استعمال کرتے ہوئے اپنے نام کے ساتھ چند الفاظ کا اضافہ کر کے اسے بڑا کر کے لکھتے ہیں لیکن انہوں نے اپنے نام سیّد انصر حسین شاہ کو مختصر کرتے ہوئے اپنا تخلص سیّد انصر استعمال کیا۔ اسی طرح ان کی کتابوں کے عنوانات بھی مختصر ہیں۔ ان کی پہلی کتاب "دسترس" کے نام سے ہے جو بالکل مختصر اور یک لفظی ہے۔ انہوں نے یہ عنوان اپنی غزل کے اس شعر سے لیا ہے:

ہزار ہاتھ ہیں پھیلے ہوئے میری خاطر
میں کس کے بس میں رہوں کس کی دسترس میں رہوں(18)

اپنے شعری مجموعہ "دسترس" کے بارے میں وہ بتاتے ہیں کہ اس کتاب کا عنوان پیش کرنا بہت مشکل تھا اور ان کی کوشش تھی کہ عنوان جامع اور ایک لفظ پر مشتمل ہو جس میں بہت سی مشکلات کا سامنا درپیش تھا۔ اس کتاب کے عنوان کے لئے بہت سے نام زیرِ غور تھے۔ بہت سوچ بچار کے بعد آخر کار ایک پر جدت اور مختصر نام سامنے آیا جو یک لفظی، جامع اور مختصر بھی تھا۔ وہ اس عنوان کے انتخاب میں کہتے ہیں:

" اس عنوان کے انتخاب کے وقت میری کوشش اور تمنا یہی تھی کہ مختصر اور یک لفظی نام ہو۔ بہت سے نام زیر غور تھے جن میں سے مجھے دسترس بہت پسند آیا۔ جس میں جدت بھی تھی اور اختصار بھی۔" (19)

ان کی دوسری کتاب "برسوں بعد" کا عنوان بھی دو لفظی اور مختصر ہے جو انہوں نے " برسوں بعد" ڈرامے کے عنوان سے لیا۔ جس کو سیّد صفدر جعفری نے پروڈیوس کیا تھا۔ اس ڈرامہ کا گیت سید انصر نے لکھا۔ یہ ڈرامہ بہت مقبول ہوا۔ اسی ڈرامہ کی مناسبت سے انہوں نے اپنی کتاب کو بھی "برسوں بعد" کا عنوان دیا۔

ان دونوں کتابوں کے اب تک تین، تین ایڈیشنز شائع ہو چکے ہیں۔ ہر ایڈیشن کی تعداد ایک ہزار تھی۔ یہ دونوں کتابیں عوام میں بہت مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔

ان کی غزلوں کو معروف گائیک استاد حامد علی خان اور استاد عطاء اللہ خان عیسی خیلوی بھی گا چکے ہیں۔ استاد حامد علی خان نے 1999ء میں (جب آپ کی کتاب بھی ابھی شائع نہیں ہوئی تھی) پہلی مرتبہ سیّد انصر کی غزل گائی۔ حامد علی خان نے وقتاً فوقتاً پانچ غزلیں گنگنائیں۔ ان میں سے ایک غزل سید انصر کی کتاب "دسترس" میں شامل ہے۔ جس کا مطلع ملاحظہ کیجیے:

دل تو کہتا ہے شب و روز یہی باتیں ہوں
پر یہ ممکن نہیں ہر روز ملاقاتیں ہوں(20)

وہ درد و الم اور محبت کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں موجود درد و الم سے کسی سے بچھڑنے کا غم جھلکتا ہے۔ اسی درد و الم پر مشتمل ان کی ایک غزل عطاء اللہ خان نے 2005ء میں ٹی وی پر گنگنائی جسے عوام میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ غزل ان کی دوسری کتاب "برسوں بعد" میں شامل ہے۔ اس طرح اور بھی بہت سی غزلیں وقتاً فوقتاً ٹی وی اور ریڈیو پر گائی جاتی رہیں۔ عطاء اللہ خان کی گائی ہوئی اس غزل کا مطلع ملاحظہ کیجیے:

ہم سے کسی کے بخت کا تارا نہیں ملا
بچھڑا جو ایک بار دوبارہ نہیں ملا(21)

ان کی شاعری میں تصوف، کربلا کے استعارے، محبت، وصال و فراق، حسن و عشق ، درد و الم، معاشرے کی زبوں حالی، سماجی ناہمواری، معاشرتی کشمکش، ظلم و جبر اور سیاسی انخلا جیسے موضوعات شامل ہیں۔ ان کی شاعری میں جدائی سے ملنے والے درد کا عنصر نمایاں ہے۔ ان کی شاعری عام انسان کے گرد گھومتی ہے اور عام موضوعات کو انہوں نے اپنی شاعری کی زینت بنایا ہے۔ ان کا انداز بیاں سادہ اور دلکش ہے۔ وہ سماجی ناہمواریوں کا درد سینے میں سموئے ہوئے اپنے قلم کو حرکت میں لاتے ہیں۔ ان کی شاعری پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ زمانے نے انہیں فکری و ذہنی پختگی عطا کی ہے۔

غیر ملکی مشاعروں میں شرکت:

اندرون ملک کے ساتھ ساتھ سیّد انصر بیرون ممالک میں بھی پاکستان کی نمائندگی کر چکے ہیں۔ پہلی بار انہیں 2007ء میں گلاسگو سکاٹ لینڈ جانے کا موقع ملا۔ وہاں "ایسوسی ایٹ آف پوئٹری اینڈ میوزک" بزم شعر و سخن میں سیّد صفدر جعفری اور ان کے بھائی سیّد ناصر جعفری نے ان کو غزل پروگرام میں دعوت دی۔ یہ دونوں بھائی ان کے رشتے داروں میں سے ہیں۔ (انہوں نے "برسوں بعد" کے نام سے ایک ڈرامہ پروڈیوس کیا تھا) اس مشاعرے کے ذریعے انہوں نے سیّد انصر کو انگلینڈ کے شعرا میں متعارف کروایا۔ اسی دوران برمنگھم یونیورسٹی گلاسکو میں مشاعرہ منعقد ہوا۔ جس میں برطانیہ کے مختلف شعرا شریک ہوئے۔ یہ مشاعرہ بریڈ فورٹ کے ایک ریستوران میں ڈاکٹر صباحت عاصم واسطی نے منعقد کیا۔ جس کی صدارت اردو کے معروف شاعر اور محقق ڈاکٹر مختار الدین نے کی۔ سیّد انصر بطور مہمان خصوصی اس مشاعرے میں شامل ہوئے۔ اسی شام کو برمنگھم ڈی ایم ڈیجیٹل ریڈیو پر انٹرویو ہوا۔ یہ انٹرویو کافی طویل تھا۔ ان کا یہ انٹرویو انگلینڈ میں بہت مقبول ہوا۔ انگلینڈ میں رہنے والے پاکستانیوں نے دل کھول کر ان کا استقبال کیا۔ اس طرح کافی لوگوں نے ان کو مشاعروں میں آنے کی دعوت دی۔ فون کالز کے ذریعے مختلف ریڈیو چینلز پر بھی انٹرویوز ہوئے۔ اسکے علاوہ ڈی ایم ڈیجیٹل اور ڈی ایم اسلام پر نعتیہ مشاعروں میں بھی شمولیت اختیار کی۔ جس کی صدارت سیّد انصر سے کروائی گئی۔ وہاں سیّد انصر نے اپنا نعتیہ کلام پیش کیا۔ جس کا مطلع یہ ہے:

کیوں مجھ کو ستائیں گی زمانے کی بلائیں
اللہ میرے دائیں ہے محمد میرے بائیں(22)

ان کے بی بی سی لندن، ایف ایم برمنگھم، نیلسن اور لندن کے مقبول ریڈیو چینلز پر شاعرانہ پروگرام ہوئے۔ پنجابی انڈین شاعر ساحر لدھیانوی ریڈیو پر پروگرام کرتے تھے۔ ان کا پروگرام بہت مقبول تھا۔ لوگ ان کا پروگرام بہت شوق سے سنتے تھے۔ انہوں نے سیّد انصر کا انٹرویو لیا تو انٹرویو کے دوران انہوں نے اپنا شاعرانہ کلام سنایا۔ جس سے سیّد انصر کو بہت شہرت ملی۔ ڈاکٹر عاصم واسطی جو کہ شوکت واسطی کے بیٹے ہیں انہوں نے بریڈ فورٹ میں ان کے اعزاز میں مشاعرہ کروایا۔ اس کے بعد برمنگھم یونیورسٹی میں ڈاکٹر صفی حسن اور آپا نسیم اختر نے بھی ان کے اعزاز میں مشاعرہ کرایا۔

دوسری مرتبہ پھر 2008ء میں انگلینڈ گئے۔ اسی طرح لندن، برمنگھم، مانچسٹر اور دوسرے شہروں میں ہونے والے مشاعروں میں شمولیت کی۔ اور شاعرانہ حلقوں میں خوب پذیرائی حاصل کی۔

پھر ہانگ کانگ میں 2011ء میں "بزم سخن" کے نام سے ہونے والے مشاعرے میں شمولیت کی۔ وہاں انہوں نے مختلف غزلیں پڑھیں۔ جن میں سے ایک غزل کا مطلع درج ذیل ہے:

اس تکلم کی ادا پر کوئی کیا بات کرے
ہونٹ چپ ہوں تو ترا رنگ حنا بات کرے(23)

یہ ان کے شعری مجموعہ "برسوں بعد" میں شامل ہے۔ اس مشاعرہ میں ان کے ساتھ اسلام آباد سے ایک بیوروکریٹ شاعر مصطفی انجم نے بھی شمولیت کی۔ اس شعری حلقہ میں انہوں نے پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوئے خوب پذیرائی حاصل کی۔

اس کے بعد وہ 2019ء میں "ادب نامہ" پروگرام میں شمولیت کے لیے دبئی گئے۔ وہاں بھی انہوں نے ادبی حلقوں میں اپنی شاعری کے ذریعے کافی مقبولیت حاصل کی۔ پروگرام ادب نامہ میں انہوں مختلف غزلیں پیش کیں جن میں سے ایک غزل کا مطلع ملاحظہ کیجیے:

ملال یہ ہے مسائل کا حل بناتے ہوئے
گنوا کے بیٹھ گئے آج کل بناتے ہوئے(24)

اس طرح ان کی شاعری نہ صرف پاکستان بلکہ بیرون ممالک میں بھی کافی مقبول ہے۔ انہوں نے اپنے شاعرانہ کلام سے ادبی دنیا میں منفرد مقام و مرتبہ حاصل کیا ہے۔ ان کی شاعری کی بنیاد مکہ و یثرب سے ہوتے ہوئے نجف و کربلا تک پھیلی ہوئی ہے۔ معاشرتی سچائی کی تلاش اور انسان دوستی کی جہات ان کے خون میں شامل ہے۔ ان کی شاعری فکر و فن کی عکاسی کرنے میں ایک اہم پیش رفت ہے جو ان کے شعری رنگ کو نمایاں کرنے میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ ان کا کلام اپنے اندر تخلیقی تسلسل کے ساتھ انفرادیت کے عنصر کو بھی بیان کرتا ہے۔ ان کے کلام کو قارئین اور سامعین میں بہت مقبولیت حاصل ہے۔ اس کلام سے ان کو بہت عزت و شہرت ملی اور ان کی شاعری کو خوب پذیرائی حاصل ہوئی۔ جلیل عالی ان کے کلام کی انفرادیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "سیّد انصر کی بنیادی شعری واردات کے علاقے مکہ و مدینہ، بدر و حنین اور نجف و کربلا تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اپنے لہو میں رچے ہوئے انہی سلسلوں سے وہ عصری

سچائیاں تلاشنا، نیک و بد شناختا اور انسان دوستی کی برتر جہات میں جینے کا جتن کرتا ہے۔۔۔ خیال و فن کے جمالیاتی اتار چڑھاؤ سے قطع نظر طبعی جوہر کی بہترین کار فرمائی کی سطح پر اس کا شعری اظہار و روایت کے تخلیقی تسلسل سے خوبصورت رشتہ استوار کرتا ہے۔ اس عمل میں بہت سے مقامات پر اس کی انفرادیت کے نقوش توجہ کھینچتے اور خوشگوار تاثر ابھارتے ہیں۔ "(25)

سیّد انصر پچھلے کئی برسوں سے شاعری سے جڑے ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں سماجی مسائل کی نشاندہی کی ہے اور "انسانی زندگی" ان کی شاعری کا سب سے اہم موضوع ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے لئے غزل کا انتخاب کیا ۔جس کی مثال یہ ہے کہ ان کی شاعری میں نظم کی بجائے غزل کا رجحان زیادہ پایا جاتا ہے۔ اب تک ان کے دو شعری مجموعے" دسترس"اور" برسوں بعد" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی شاعری فنی اعتبار سے بھی ایک عمدہ شاعری ہے۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں عروض اور اوزان کے تمام پہلوؤں کو مناسب انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے نفیس اور بامروت ہونے کی وجہ سے ان کے احباب کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انہوں نے شاعری میں ایک استاد کے طور پر بھی اپنا نام بنا رکھا ہے ۔وہ بہت سے نئے شعرا کو شاعری کے عروض و اوزان سکھاتے ہیں۔ اس لیے بھی انہیں ادبی حلقوں میں بہت عزت و احترام سے دیکھا جاتا ہے۔ جہلم سے ان کے ہم عصر شاعر اقبال ناظر سیّد انصر کی شاعری اور اخلاقیات کے بارے میں یوں بیان کرتے ہیں:

" سیّد انصر کی شاعری کا مرکز انسانی زندگی کے مسائل اور اس کے اسرار و رموز بیان کرنا ہے۔ سید انصر یوں تو شاعری کے فکری اور فنی دونوں پہلوؤں پر دسترس رکھتے ہیں مگر ان کی خاص توجہ شعر کے فنی پہلو یعنی عروض و اوزان کی طرف رہتی ہے۔ سید انصر کا حلقہ احباب وسیع ہے اور شاعری میں ان کے شاگرد بھی ہیں۔۔۔ میرا ان سے مراسم کا سلسلہ کوئی پندرہ بیس برس سے ہے۔ میں جب بھی ان سے ملا ہوں انھیں مہربان اور ملنسار پایا۔ " (26)

ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ عہد حاضر میں درپیش حادثات اور واقعات پچھلی نسل کے حصے میں نہ تھے اور آنے والی نسل کے لیے ان حالات سے زیادہ تبدیلیاں رونما ہوں گی۔ ان تبدیلیوں کی رونمائی کا اثر انسان کی زندگی پر کس انداز میں پڑے گا اس کا تصور کرنا بہت مشکل ہے۔ سید انصر نے روز بدلتی ہوئی دنیا میں اپنے

حصے کو شامل کرنا ضروری سمجھا۔ انہوں نے اپنی شاعری میں دنیا اور انسان کی تبدیلیوں کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ زندگی کے ہموار راستے پر اچانک آ جانے والی ناہمواری اس شاعری کا اصل موضوع ہوتا ہے جس کو انہوں نے اپنی شاعری میں غیر معمولی طور پر بیان کیا ہے۔ سید انصر کی شاعری کے بارے میں شاعر شہزاد احمد ان کی کتاب "دسترس" کے فلیپ میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

> "جدید تر نسل جس کے ایک نمائندہ شاعر سید انصر ہیں اس گمان میں ہیں کہ روز بدلتی ہوئی دنیا میں ان کا حصہ ضرورت سے زیادہ ہے۔۔۔ سید انصر کا پہلا مسئلہ تبدیل ہوتی ہوئی دنیا اور انسان سے متعلق اس کے رشتے ہیں، یہ تبدیلیاں انسان کو زمین پر قدم جمانے ہی نہیں دیتیں۔۔۔ چلتے چلتے زندگی میں جو موڑ اچانک آ جاتے ہیں، وہی شاعری کا اصل موضوع ہیں اور اس کا شعور سید انصر کو غیر معمولی طور پر زیادہ ہے۔" (27)

بہت سے شعرا ان کے بارے مختلف اور اچھے نظریات رکھتے ہیں۔ نہ صرف پاکستان بلکہ بیرون ممالک کے شعرا بھی ان کی شاعری کو سنتے، پڑھتے اور اس پر تبصرے کرتے ہیں۔

سیّد انصر کا تعلق سرائے عالمگیر سے ہے۔ وہ نوے کی دہائی میں سامنے آنے والے جدید شعرا میں شامل ہیں۔ ان کی غزلیں ابتدا میں مختلف جرائد و رسائل کا حصہ بنتی رہیں بعد میں انہیں کتابی شکل دے گئی۔ اب تک ان کے دو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور تیسرا شعری مجموعہ زیر طبع ہے۔ وہ ادبی تنظیم "کاروان ادب" کے صدر کی حیثیت سے ادبی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ اس تنظیم کا مقصد نئے آنے والے شعرا کو متعارف کرانا ہے۔ اس تنظیم کے ذریعے اب تک مختلف شہروں میں بہت سے مشاعرے کیے جا چکے ہیں۔ اس کا صدر دفتر سرائے عالمگیر میں ہے۔ سیّد انصر کو عروض و اوزان پر مکمل مہارت حاصل ہے وہ شاعری میں ایک استاد کے طور پر بھی مانے جاتے ہیں۔ فکری صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ انہیں فن پر بھی دسترس حاصل ہے۔ وہ اندرون ملک کے ساتھ ساتھ بیرون ممالک میں بھی اپنی شاعری کے ذریعے پاکستان کی نمائندگی کر چکے ہیں۔ ان کی شاعری نے انہیں ادبی دنیا میں الگ مقام و مرتبہ عطا کیا ہے جس نے انہیں مغرور نہیں بلکہ عاجز انسان بنایا ہے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ شاعری تنہائی کی مرہون منت ہوتی ہے۔ دوسرے شعرا کی طرح ان کی شاعری کا آغاز بھی محبت و اداسی سے ہوا۔ ان کی خاموش طبعی انہیں شاعر بنانے کا سبب بنی۔ وہ

خاموشی سے معاشرے کا مشاہدہ کرتے اور اسے اپنی شاعری کا حصہ بناتے ہیں۔ وہ آج کی بے ہنگم شاعری نہیں کرتے بلکہ ان کی شاعری سچائیوں کی متلاشی ہے۔

ان کی شاعری میں انسانیت کی فکر کے ساتھ ساتھ تحریک انقلاب اور معاشرتی وسیاسی نظام میں پائے جانے والے مسائل کی نشاندہی اور ان کے حل کا تذکرہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کی شاعری میں حسن و عشق اور محبت کے معاملات کا بھی اندراج نمایاں ہے اور یہ جذبات اور کیفیات کے دائرے میں بھی گھومتی ہے۔ اس میں درد و غم، خواب وخیال کے ساتھ ساتھ خواہشات و امید کی دنیا بھی نمایاں نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری میں رنگ تغزل نمایاں ہے۔ ان کی غزلوں میں فکر کے وہ تمام عناصر پائے جاتے ہیں جو کسی بھی معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ہیں۔ انہوں نے سیاست کے منفی عناصر اور معاشرتی گراوٹوں کی عکس بندی بہترین انداز میں کی ہے۔

ان کے کلام میں انسانیت اور صداقت کی سوچیں کار فرما ہیں۔ فکری انقلاب کی تحریک اور محبت و رومانیت کے معاملات ان کی شاعری میں رچے بسے ہیں۔ خواب وخواہش سے مبرا کوئی انسان نہیں یہ چیزیں ایسی ہیں جن سے نت نئے امکانات کی راہیں کھلتی ہیں۔ چنانچہ سیّد انصر نے بھی خواب دیکھے اور خواہشوں اور امیدوں کی دنیا قائم کی ہے۔ ان کا کلام حقیقت پسندی، شائستگی اور پاکیزگی کے بہت قریب پایا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک بے وفائی ایک ناپسندیدہ عمل ہے اور وفا کو دنیا کا سب سے عظیم فعل جانا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک محبت ایک پاکیزہ جذبہ ہے اور حسن کا کام پردے میں رہنا ہے۔ ان کے اشعار بے معنی اور بے رنگ نہیں بلکہ ان کی شاعری میں سچائی اور معنویت کی ایک عمدہ مثال موجود ہے۔ ان کی شاعری ان کی شخصیت کی طرح واضح اور نمایاں ہے۔ ان کے اشعار میں سماجی و معاشرتی تبدیلیوں کو بیان کرنے کی کوشش نمایاں ہے۔ وہ آج کے دور کی بے ہنگم شاعری نہیں کرتے بلکہ ان کی شاعری بامقصد اور سچائیوں کی متلاشی ہے۔ وہ سنجیدہ مزاج انسان ہیں اس لیے ان کی شاعری بھی سادگی اور سلاست کا مرقع ہے۔ وہ ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے انسان بھی ہیں۔ وہ دوسروں سے ملنساری اور شفقت سے پیش آتے ہیں۔ ان کے نزدیک محبت پاکیزگی کا نام ہے۔ سماجی مسائل کا شعور ان کی شاعری میں نمایاں ہوتا ہے۔

حوالہ جات

1 بشیر فاطمہ ، بہن ، انٹرویو، قاضی باقر سیّداں، سرائے عالمگیر، 6فروری 2022ء ،وقت دن 9:40

2 بشیر فاطمہ،بہن،انٹرویو، قاضی باقر سیّداں،سرائے عالمگیر، 6فروری2022ء،وقت دن 9:50

3 سیّد انصر،انٹرویو،سرائے عالمگیر، گجرات، 3فروری2022ء،وقت دن9:50

4 سیّد انصر،انٹرویو،سرائے عالمگیر، گجرات،19 مارچ 2022،وقت دن9:20

5 سیّد انصر،انٹرویو، سرائے عالمگیر، گجرات، 14اپریل2022ء،وقت دن10:00

6 تسلیم ظاہرہ،زوجہ،انٹرویو،سرائے عالمگیر، گجرات، 4فروری2022ء،وقت دن9:30

7 سیّد انصر،انٹرویو،سرائے عالمگیر، گجرات، 14اپریل2022ء،وقت دن9:10

8 سیّد امیر حمزہ شاہ، بیٹا، انٹرویو، سرائے عالمگیر، گجرات ، 4فروری 2022ء، وقت دن 2:10

9 صالحہ انصر،بیٹی،مباحثہ،انٹرویو،سرائے عالمگیر، گجرات، 19مارچ2022ء،وقت دن11:00

10 سیّد انصر،انٹرویو،سرائے عالمگیر، گجرات، 3فروری2022ء،وقت دن11:30

11 سیّد انصر،انٹرویو،سرائے عالمگیر، گجرات، 3فروری2022ء،وقت دن11:40

12 سیّد انصر،انٹرویو،سرائے عالمگیر، گجرات، 19مارچ2022ء ،وقت دن11:50

13 سیّد انصر،انٹرویو،سرائے عالمگیر، گجرات، 3فروری2022ء ،وقت دن12:00

14 سیّد انصر،انٹرویو،سرائے عالمگیر، گجرات، 19مارچ2022ء ،وقت دن12:15

15 سیّد انصر،انٹرویو،سرائے عالمگیر، گجرات، 14اپریل2022ء،وقت دن11:00

16 شاہد ذکی،خوابوں سے خالی آنکھیں،الحمد پبلیکیشنز،لاہور، 1999ء،ص41

17 سیّد انصر،انٹرویو،سرائے عالمگیر، گجرات، 3فروری2022ء،وقت دن11:10

18 سیّد انصر،دسترس،الحمد پبلی کیشنز،لاہور، 2000ء،ص:78

19 سیّد انصر،انٹرویو،سرائے عالمگیر، گجرات، 14 اپریل2022ء،وقت دن11:30

20 سیّد انصر،دسترس،الحمد پبلی کیشنز،لاہور، 2000ء،ص:103

21 سیّد انصر،برسوں بعد،ارباب ادب پبلی کیشنز،لاہور،2006ء،ص:34

22 سیّد انصر،برسوں بعد،ص:15

23 ایضاً،ص:108

24 سیّد انصر، تعجب، غیر مطبوعہ

25 جلیل عالی،فلیپ، مشمولہ: سیّد انصر،برسوں بعد،ارباب ادب پبلی کیشنز،لاہور،2006ء

26 اقبال ناظر،ہم عصر شاعر،انٹرویو،بمقام کونتریلہ جہلم، 14 مئی 2022ء

27 احمد شہزاد، فلیپ، مشمولہ: سیّد انصر،دسترس،الحمد پبلیکیشنز،لاہور،2000ء

باب دوم

اُردو غزل کا فکری ارتقا

جذبات اور احساسات کو لفظوں میں بیان کرنے کو شاعری کہتے ہیں۔ یہ دراصل تصور خیال کے اظہار کا نام ہے۔ یہ دل اور دماغ دونوں کو معطر کر دیتی ہے۔ عقل و شعور کے حسین امتزاج کو شاعری کہا جا سکتا ہے اور یہ عقل پہ چھائے ہوئے اندھیروں کو روشن کرتی ہے۔ شاعری کے بغیر زندگی بے رنگ و بو ہے۔ اپنے جذبات کو الفاظ کی شکل دینا شاعری ہے لہذا شاعری جذبات کی عکاسی کرتی ہے۔ شاعری تصورات اور حقیقت کا امتزاج ہے اور یہ روحِ انسانی کے لیے تسکین کا باعث بنتی ہے جس سے دل و جاں میں سکون محسوس ہوتا ہے اور جسم مسرور ہو جاتا ہے۔ شاعری کے بہت سے پہلو ہیں جن میں حسن و عشق، درد و الم، طنز و مزاح، فلسفیانہ انداز، معاشرتی گراوٹ، تصوف، سیاسی انحلا اور زندگی کے مختلف پہلو شامل ہیں۔ وہ کلام جو بلا ارادہ کسی بات کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال ہو اسے شعر کہتے ہیں۔ شاعری کسی انسان کے احساسات اور جذبات کو ظاہر کرنے کا ذریعہ ہے۔

شاعری کے لیے تخیل اور شعور کا عمدہ ہونا ضروری ہے چونکہ شاعر اپنی داخلی کیفیات کو شاعری کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ شاعری دراصل محسوسات کا نام ہے اور شاعر اپنے جذبات کے ذریعے ماحول سے جو محسوس کرتا ہے اسے شاعری میں بیان کر دیتا ہے۔ یہ محسوسات عام بھی ہو سکتے ہیں اور بہت آفاقی بھی۔ شاعری کے مختلف درجات ہوتے ہیں سب سے اعلی درجہ کی نوعیت وہ ہے جس میں آفاقیت ہو اور شاعر اپنے جذبات کو بہت اچھے انداز میں بیان کر سکے۔ شاعری دراصل محسوسات کو پرکھنے کا نام ہے شاعر جو بھی انفرادی اور داخلی معاملات ہوں ان کو شاعری کی صورت میں بیان کر دیتا ہے اور شاعر جو بھی لکھتا ہے اس کا اطلاق نہ صرف اس کے اپنے اوپر بلکہ دوسروں پر بھی ہو سکتا ہے۔

شاعری نہ صرف داخلی کیفیات بلکہ خارجی کیفیات کی بھی پیروکار ہوتی ہے جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ قارئین شاعری میں استعمال ہونے والے الفاظ اور انداز کو ایسے محسوس کرتے ہیں جیسے یہ ان کے اپنے دل کی آواز ہے۔ شاعری جذبات کا نام ہے اور یہ جذبات ہی شاعر کو موضوعات سے وابستہ کرتے ہیں۔ شاعری کے لیے تخیل کا بلند ہونا اور خارجی و داخلی کیفیات کا عمدہ ہونا، شاعری میں محسوسات کو نمایاں

کرتا ہے۔ شاعری میں استعمال ہونے والا لہجہ اور اس کے مختلف انداز پڑھنے اور سننے والوں کے دل پر اثر کرتے ہیں اور یہ الفاظ انہیں ایسے محسوس ہوتے ہیں جیسے ان کے اپنے دل کی بات ہو۔ شاعری میں در اصل موضوع اور مواد کا انحصار محرکات پر ہوتا ہے وہ محرکات جو کسی شاعر میں شاعری کی امنگ اور جذبات پیدا کرتے ہیں۔ شاعری کے لئے جذبے کے ساتھ وابستگی ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر شاعری کا تصور ممکن نہیں۔عبادت بریلوی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "شاعری میں سب سے زیادہ اہمیت تو عناصر کو حاصل ہے جو موضوع اور مواد کو ایک خاص شکل دیتے ہیں۔ جذبہ ان عناصر میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ شاعر جو کچھ بھی شاعری کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ اس کو ہر صورت میں جذبے کے ساتھ وابستہ ہونا پڑتا ہے۔ جذبے کے بغیر شاعری کا کوئی تصور نہیں کیا جاسکتا۔"(1)

شاعری مختلف رنگوں کا امتزاج ہے اور یہ لفظ شعر سے ماخوذ ہے جس کا مطلب چیزوں کی جان، پہچان اور واقفیت حاصل کرنا ہے یعنی کسی شعر سے مراد کسی بات یا چیز کی واقفیت ہے۔ بہترین شاعری کے لئے عناصر وزن، ردیف، قافیہ اور بحر کا بہتر ہونا ضروری ہے جس سے شاعری میں خوبصورتی اور نغمگی آتی ہے اور الفاظ میں شعریت کی وجہ سے رنگ و آہنگ پیدا ہوتا ہے۔ کسی تصور، خیال، کیفیت، جذبات اور نظریات کو وزن، ردیف، قافیہ اور ارادہ کے ساتھ بہترین الفاظ میں بیان کرنا شعر کہلاتا ہے۔ شاعری کی ویسے تو بہت سی قسمیں ہیں جیسا کہ حمد، نعت، غزل، نظم، قصیدہ، رباعی وغیرہ لیکن ان سب میں غزل نے بہت اہمیت حاصل کر رکھی ہے۔

غزل:

غزل سے مراد عام طور پر عورتوں سے باتیں کرنا یا عورتوں کے بارے میں باتیں کرنا ہے۔ غزل اس آواز کو بھی کہتے ہیں جو شکار کے وقت ہرن کے منہ سے نکلتی ہے۔ غزل عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی عورتوں کے متعلق گفتگو کرنا ہے۔ غزل کا ہر شعر ایک مکمل مفہوم بیان کرتا ہے۔ سب سے پہلے غزل عربی اور اس کے بعد فارسی سے ہوتے ہوئے اردو زبان میں لکھی گئی۔ کسی بھی غزل کے لیے وزن کا ہونا بہت ضروری ہے۔ غزل کے پہلے شعر کو مطلع کہا جاتا ہے اور اگر شاعر اپنا تخلص استعمال کرے تو آخری شعر کو مقطع کہا جاتا ہے۔ اگر غزل کے آخری شعر میں شاعر اپنا تخلص استعمال نہیں کرتا تو وہ محض ایک شعر ہو گا۔

غزل کا ماخذ عربی قصیدے کا ابتدائی حصہ تشبیب ہے لیکن ڈاکٹر وزیر آغا اس بات سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کے مطابق اردو غزل کا رشتہ تشبیب کی بجائے ایرانی صنف جامہ سے ملانا نہایت موزوں ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی اس بارے میں لکھتے ہیں:

"صنف غزل ایران کی پیداوار ہے۔ اس نے ایران ہی میں آنکھ کھولی اور وہیں ترقی کی منزلیں طے کیں۔ ایران کے مخصوص حالات غزل کو وجود میں لانے اور اس کو آگے بڑھانے میں مدومعاون ثابت ہوئے۔"(2)

غزل سے مراد اس آواز کو بھی کہا جاتا ہے جو شکار کے وقت ہرن کے منہ سے نکلتی ہے۔ ہرن جب شکاری کتوں یا شیر کو دیکھتا ہے تو بھاگنے کی کوشش کرتا ہے اور بھاگتے بھاگتے تھک جائے تو اس بے بسی کے عالم میں اس کے منہ سے جو درد بھری آہ نکلتی ہے اس کی شدت سے جو شکاری کتوں پر رقت طاری ہوتی ہے اس کو غزل کہا جاتا ہے۔ غزل کی تاثیر کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ غزل کے اشعار میں ایک قسم کا درد پایا جاتا ہے۔ غزل کے اشعار ہر قسم کے حالات میں تبدیلی کا ظرف رکھتے ہیں۔ غزل ہمارے معاشی، معاشرتی اور سماجی حالات وواقعات کی ترجمانی کرتی ہے۔ ہر قسم کے حالات وواقعات کو غزل میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ غزل کی خوبصورتی یہ ہے کہ غزل علامت اور رمز و کنایہ کے پردے میں بات کرتی ہے۔ غزل کے ہر شعر کا اپنا لب ولہجہ اور مرتبہ ہوتا ہے۔ فکری اعتبار سے ہر شعر دوسرے شعر سے الگ ہوتا ہے لیکن ردیف اور قافیہ کی ہم آہنگی ضروری ہے۔ اس ضمن میں فراق گورکھپوری اپنی رائے یوں دیتے ہیں:

" قافیہ میں آواز کی یکسانیت، وحدت و کثرت، تنوع اور ہم آہنگی ہے جو ایک پیٹرن کی خصوصیت ہوتی ہے۔ جس سے غزل کی تشکیل میں یک رنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ معاملہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ بحر، زمین، مطلع، مقطع، قافیہ، ردیف یہ سب غزل کے سانچے کے نہایت دھندلے عکس یا نشانات ہیں۔"(3)

غزل میں تین اہم کردار اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ عاشق، محبوب اور رقیب۔ پوری غزل ان تینوں کرداروں کے گرد گھومتی ہے۔ شاعر یعنی عاشق اپنے محبوب کی خوبصورتی اور محبت کو بیان کرتا ہے۔ بعد میں محبوب کے ظلم و ستم بھی بیان کرتا ہے اور رقیب سے نفرت کا اظہار بھی کرتا ہے۔ غزل میں شاعر اپنے جذبات کو محبوب سے محبت کے اظہار اور اس کی تعریف کے لیے کرتا ہے اور محبوب سے اپنے جیسی چاہت رکھنے والے سے اظہار ئے برہمی کرتا ہے۔

غزل کا آغاز:

غزل کا آغاز فارسی زبان سے ہوا مگر اس کا سراغ عربی تک بھی لگایا جاتا ہے۔ کیونکہ عربی صنف قصیدہ میں تشبیب نامی حصے سے غزل کی ابتدا ہوئی۔ غزل کی اردو ادب میں کامیابی اور پسندیدگی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ ہر دور میں اہل اردو کے جذبات و احساسات کا ساتھ نبھانے میں کامیاب رہی ہے۔ تیزی سے بدلتے ہوئے داخلی و خارجی حالات و واقعات کے اتار چڑھاؤ کے باوجود ہر دور کے شاعر غزل کو اپنا موضوع سخن بناتے رہے اور ہر قسم کے تجربات کو غزل میں کامیابی سے بیان کرتے رہے ہیں۔ جس کے نتیجے میں اردو کی دوسری اصناف قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی وغیرہ رفتہ رفتہ قبول عام کے درجے سے گر گئیں۔ مگر غزل اپنی مقبولیت کے لحاظ سے روز بروز بڑھتی رہی ہے۔ اردو غزل کا سب سے بڑا نمائندہ ولی دکنی کو کہا جاتا ہے۔ لیکن ولی دکنی سے غزل کا آغاز نہیں ہوا تھا بلکہ اس سے پہلے بھی دکن کے بہت سے غزل گو شعرا ملتے ہیں جنھوں نے غزل میں طبع آزمائی کی۔ جن میں قلی قطب شاہ، نصرتی، غواصی اور ملا وجہی شامل ہیں۔ تاہم ولی پہلا شخص تھا جس نے پہلی بار غزل میں مقامی تہذیبی قدروں کو سمویا۔

غزل کا ارتقا:

غزل کے لغوی و اصطلاحی معنی جاننے کے بعد اس امر کی ضرورت ہے کہ غزل کا آغاز کہاں سے ہوا۔ قصیدے سے اس صنف نے پہلے عربی میں سفر کیا پھر فارسی میں اپنی جگہ بنائی۔ غزل قصیدے کی تمہید کے طور پر عربی سے فارسی میں آئی۔ لیکن غزل کو قصیدے سے الگ اور منفرد صنف تسلیم کرنے میں فارسی زبان کو اہمیت حاصل ہے۔ اردو کے علمائے ادب نے یہ اعزاز فارسی کو دیا ہے۔ علامہ شبلی نعمانی اس بارے میں لکھتے ہیں:

> "عرب میں مدحیہ قصیدے کا یہ اندازہ تھا کہ تمہید میں عشقیہ اشعار ہوتے تھے جن کو تشبیب کہتے ہیں۔ پھر کسی تقریب سے ممدوح کا ذکر کرتے تھے۔ اس کو اصطلاح میں تخلص یا گریز کہتے ہیں۔ پھر مدح ہوتی تھی۔ فارسی نے سراپا اس کی تقلید کی۔۔۔ قصیدے کے حسن کا معیار تین چیزیں ہیں۔ 1. مطلع 2. تخلص یا گریز 3. مقطع یا خاتمہ۔۔۔" (4)

علامہ شبلی نعمانی کی یہ رائے غزل کا قصیدے سے تعلق قریب کر دیتی ہے یعنی غزل قصیدے کا حصہ ہے۔ قصیدے کا حسن و عشق والا حصہ الگ کر کے اسے غزل کا نام دے دیا گیا۔ اس سے اس بات کا بھی اندازہ

ہوتا ہے کہ غزل رودؔکی سے شروع ہوئی لیکن زیادہ قیاس یہ ہے کہ غزل رودکی سے پہلے اپنا آغاز کر چکی تھی۔ مندرجہ بالا تعریفوں سے واضح ہوتا ہے کہ غزل کی ابتدا عربی سے ہوئی پھر یہ فارسی میں پہنچی کیونکہ فارسی غزل کے اوزان عربی کے اوزان سے ہی لیے گئے ہیں۔ اس بات کی وضاحت کو دستاویزی ثبوت سے ثابت نہیں کیا جاسکتا لیکن اس بات کی تردید کی جاسکتی ہے کہ فارسی شاعری عربی کے اثرات قبول کرنے کے نتیجے میں وجود میں آئی۔ مولانا شبلی نعمانی شعر العجم میں لکھتے ہیں:

"فارسی شاعری کا آدم رودکی خیال کیا جاتا ہے کہ اس کے زمانے میں غزل کی صنف مستقلاً وجود میں آچکی تھی۔ عنصری کہتا ہے کہ:

غزل رودکی وار نیکو بود

غزل ہائے من رودکی وار نیست

رودکی نے نہ صرف یہ کہ قصیدے سے عشقیہ شاعری کو الگ کر کے غزل کا پیکر تیار کیا۔ اس کے برتنے کا پہلا عملی تجربہ کیا بلکہ غزل میں عشقیہ شاعری کا ایک معیار بھی قائم کر دیا۔"(5)

موضوع کے لحاظ سے عربی شاعری اسلام سے پہلے بھی غزل سے خالی نہیں مگر قصیدے سے الگ ایک منفرد صنف سخن کے طور پر غزل اسلامی دور میں وجود میں آئی۔ بعد ازاں عباسی خلفا کے دور میں غزل فارسی زبان میں رائج ہو کر زیادہ تیزی کے ساتھ ارتقائی مراحل طے کرتی نظر آتی ہے۔ فارسی میں سنائی جیسے صوفی شاعر کے ذریعے سے غزل نے اسلامی، تہذیبی و فکری میلانات کو تصوف کے حوالے سے اپنے اندر واضح طور پر جذب کرنا شروع کر دیا۔ یہاں سے غزل نے دیگر اسلامی ریاستوں کی طرف اپنا سفر شروع کر دیا۔ جیسا کہ ترکی میں غزل پر فارسی رنگ نمایاں ہے اور یہ اسی سے مقبول ہوئی کیونکہ ترکی کے ادب میں کوئی اس قسم کی شعری روایت موجود نہ تھی جس سے غزل کا پس منظر واضح ہو سکتا۔ ترک غزل میں مروجہ اصطلاحات مثلاً مطلع، حسن مطلع، قافیہ، ردیف، اشعار کی تعداد، اوزان وبحور اور دیوان کی ردیف وار ترتیب وہ سب کچھ ہے جو فارسی میں رائج ہو چکا تھا مولانا رُومی سے اور بعد میں مولانا عبد الرحمن جامی سے ترکی شاعری میں بڑا اثر لیا گیا۔

انسانی تہذیب اور معاشرے کے مختلف عناصر کے باعث غزل میں مخصوص تصورات قائم ہوتے گئے۔ مثال کے طور پر غزل حسن وعشق کی شاعری ہے مگر بعد میں اس میں دوسرے مضامین بھی شامل

کر لیے گئے۔ کلاسیکی شاعری میں زیادہ تر ہجر و وصال کے مضامین ہی ملتے ہیں جس کے تین کردار عاشق، محبوب اور رقیب ہیں۔ کلاسیکی غزل میں عشق کا بہترین تصور صوفیانہ نظریہ ہے جن کا خیال ہے کہ جس دل میں درد اور سوز و گداز نہ ہو اس میں خدا نہیں سما سکتا۔ اس لئے سوز و گداز بھی غزل کا اٹوٹ حصہ بن گیا۔ معاشرہ تبدیل ہونے کے ساتھ ساتھ ان تصورات میں بھی تبدیلی ہوتی گئی۔ مثلاً ترقی پسند دور میں غزل کا عاشق بدنصیبی اور سوز و گداز کو چھوڑ کر بغاوت اور انقلاب پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح ہر تہذیب کا اپنا ایک الگ تصور کائنات ہوتا ہے۔ کسی بھی معاشرہ میں وقت کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ تصور کائنات بھی تبدیل ہوتا ہے۔ مثلاً کلاسیکی تہذیب میں یہ بنیادی تصور تھا کہ انسان اپنی مرضی سے اس کائنات میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکتا۔ وہ اس معاملے میں مجبور محض، اجنبی اور اکیلا ہے مگر بعد میں ترقی پسند شعرا اور جدید غزل گو شعرا کے کلام میں اس بنیادی تصور میں واضح تبدیلی دیکھی جا سکتی ہے۔

شروع میں غزل میں محض عشقیہ موضوعات بیان کیے جاتے تھے لیکن آہستہ آہستہ اس میں اخلاق، تصوف، فلسفہ، رندی، سرمستی اور آخر میں سیاسی اور سماجی مسائل بھی بیان ہونے لگے۔ گویا اس کی ہئیت اور موضوعات میں اتنی لچک ہے کہ اس میں ہر قسم کے مضامین کی گنجائش ہے۔ بقول شبلی نعمانی:

> "غزل بنیادی طور پر عشقیہ شاعری ہے رودکی سے لے کر ناصر کاظمی تک ایک ہزار سال کے طویل عرصے میں غزل میں مضامین کے اعتبار سے اس قدر وسعت پیدا ہو چکی ہے کہ آج عشق و محبت، فکر و فلسفہ، دین و اخلاق، عرفان و تصوف، سیاست اور معیشت، نفسیاتی اور سماجی مسائل، کائنات کی وسعتیں اور باطن کی گہرائیاں۔ غرضیکہ حیات و کائنات کا ہر پہلو غزل گو شعراء کی دسترس میں ہے۔" (6)

اردو غزل کی ابتدا دکن سے ہوئی۔ اس حوالے سے جو نام ہمارے ذہن میں آتے ہیں۔ ان میں سلطان محمد قلی قطب شاہ، خاکی، نوری اور غواصی اہم ہیں۔ ان کی شاعری میں غزل کے رنگ ڈھنگ کے ابتدائی نقوش معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی زبان خالص دکنی تھی۔ لیکن ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ اردو غزل کو پہلی دفعہ ہئیتی سطح پر ولی دکنی نے ہی مرتب و مزین کیا اور اس صنف کے لیے مستقبل کی راہیں کھول دیں۔ اس لیے ان کو اردو غزل کا "باوا آدم" کہا جاتا ہے۔ ولی نے اس انداز سے ریختہ زبان میں غزل گوئی کی کہ غزل ایک ہی جست میں دکن سے شمال کا سفر طے کر لیتی ہے اور شمالی ہند میں تو حال یہ ہوا کہ غزل کا ڈنکا چہار جانب

بجنے لگا۔ ولی کے ہم عصر شعرا میں سراج، داؤد، عزلت اور عاجز خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ جنھوں نے خالصتاً دکنی زبان استعمال نہیں کی بلکہ ان کی زبان پر شمالی ہند کے اثرات نظر آتے ہیں۔ شمالی ہند میں پہلے دور کے شاعروں میں خان آرزو، شرف الدین مضمون، ناجی، آبرو، فغاں، شاکر اور شاہ حاتم وغیرہ اہم ہیں جنہوں نے حالی کی پیروی میں غزل کی صنف میں طبع آزمائی کی۔ یہ ایہام گوئی کے نام سے ایک وقتی رجحان تھا جسے خود اس عہد کے شعرا نے بعد میں ترک کر دیا۔ اس کے بعد غزل کا وہ دور سامنے آیا جسے ''عہد زریں'' کے نام سے یاد کرتے ہیں یعنی میر و سودا کا عہد۔ اس عہد میں غزل کی صنف نے خوب ترقی کی۔ میر نے غزل کو اور غزل نے میر کو لافانی بنا دیا۔

خواجہ میر درد نے اس عہد میں غزل کو ایک اور لب و لہجہ عطا کیا۔ اس طرح اس عہد کی غزل میں سادگی، سلاست، تصوف، داخلی و وجدانی کیفیات کی ترجمانی نے غزل کو دلکش و دل پذیر بنا دیا۔ پھر غالب و مومن کے عہد میں غزل نے اپنے اندر وسعت پیدا کی۔ مضامین میں جدت و ندرت نظر آنے لگی، عشق و محبت اور فکر و فلسفہ کی آمیزش نے غزل کو مئے دو آتشہ بنا دیا۔ غالب و مومن تک غزل کے ارتقائی سفر میں مصحفی، انشا، جرات، آتش و ناسخ وغیرہ شریک رہے جس کے درمیان کچھ معرکے بھی ہوئے اور کچھ بے راہ روی پیدا ہوئی۔ اس طرح دہلی دبستان سے الگ لکھنوی دبستان نے اپنی ایک شناخت قائم کی جہاں داخلیت کے بجائے خارجیت پر زور ملتا ہے۔ غزل کے ایسے اوصاف جو عہد میر نے غزل کو بخشے غزل ان سے محروم ہوتی ہوئی نظر آتی ہے لیکن مختصر عرصے میں ہی غزل کی عزت و عظمت کو غالب نے سنبھالا دیا۔ اس طرح غالب، میر کے بعد اردو غزل کا دوسرا نقطہ عروج بن کر سامنے آئے۔ انہوں نے غزل کو اس طرح نیا پن دیا کہ وہ مایہ ناز صنف سخن بن گئی۔ میر نے اگر ایک طرف غزل کو زمین سے جوڑنے کی کوشش کی اور وارداتِ قلب کے اظہار کا ذریعہ بنایا تو غالب نے اس میں فلسفہ حیات و کائنات کا رنگ بھر کر بے مثال اور لازوال کر دیا۔ مومن نے خیالات کی نزاکت کے ذریعے اپنی شناخت بنائی۔ ذوق نے غزل میں دقیق مضامین کی روایت کا آغاز کیا اور زبان کی شگفتگی پر خصوصی توجہ دی۔ بہادر شاہ ظفر نے اثر انگیزی کے ساتھ مخصوص لب و لہجے میں کیفیات دل بیان کیں۔

اس سے قبل کہ اردو غزل اپنا ارتقائی سفر طے کرتی ہوئی شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال تک پہنچے دو اہم شعرا کا تذکرہ ضروری ہے اور وہ نام ہیں داغ دہلوی اور امیر مینائی۔ ان کی غزلوں کی بعض دیگر خصوصیات کے ساتھ ساتھ ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے یہاں اردو غزل کی تاریخ میں شاید پہلی مرتبہ دہلی اور لکھنو

کے شعری مزاج کا امتزاج ملتا ہے۔ انہوں نے معاشرتی گراوٹوں کو اپنی شاعری میں پرویا۔ اقبال کو عام طور پر نظم کا شاعر سمجھا گیا ہے حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی غزل بھی اپنے اندر وہی نکتہ سنجی رکھتی ہے جو اقبال کی نظم کی ایک خاصیت ہے۔ انہوں نے شاعری میں تصوف اور خودی کو پروان چڑھایا۔ اس دور کے بعد جگرؔ، اصغر، فانیؔ، حسرت اور شاد اہم شاعر ہیں۔ بعد ازاں فراق اردو غزل کی دنیا میں ایک نئی آواز کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ اس آواز کے ساتھ ناصر کاظمی کا غم بھی شامل ہوتا ہے۔

فیضؔ کی انقلابی لے اور آگے بڑھ کے مجروح کا تغزلؔ، مجازؔ کی انقلابیت، سردار جعفری اور پرویز شاہد کی بلند آہنگی شامل ہو جاتی ہے۔ غزل کا لہجہ 1947ء کے بعد یکسر تبدیل ہوتا ہے اور یہ غزل عہد نو کے تقاضوں کا استقبال کرتی ہے۔ ان میں حسن نعیم، شاد، تمکنت، منیر نیازی، شہرت بخاری، فراز، ظفر اقبال، شکیب جلالی، جون ایلیا، بانی، مظہر امام، شہریار، مخمور سعیدی، سلطان اختر، صدیق مجیبی، عرفان صدیقی، حسین تابش، باقر مہدی، ساقی فاروقی، منظر، حنفی، کشور ناہید اور پروین شاکر، کمار ریاستی، وہاب دانش، پرکاش، افتخار عارف اور بہت سے دوسرے نام غزل کے نئے تجربات اور نئے ذائقے سے روشناس کراتے ہیں۔

تمام اصناف سخن میں غزل قدیم ترین صنف ہے۔ غزل کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں بہت سے خیالات ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں جو کہ قارئین کو محظوظ کرتے ہیں جہاں تک قافیہ اور ردیف کا تعلق ہے یہ غزل میں موسیقیت کا تاثر پیدا کرتے ہیں جس سے غزل میں دلچسپی بڑھتی ہے۔ غزل قدیم صنف ہے مگر اس کی تروتازگی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ قائم رہے گی۔ غزل کے حوالے سے شمیم احمد یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں:

> "اگر اردو شاعری کبھی زندہ رہی تو غزل کے ساتھ ہی رہے گی۔ لوگ چاہے کتنے ہی دعوے کیوں نہ کریں اور نظم میں چاہے جتنا بڑا ذہن چلائیں لیکن جب آدمی تنہائی میں شعر گنگنائے گا تو وہ غزل کا ہو گا نظم کا نہیں ہو سکتا۔ چند سال بعد نظم کے مارے ہوئے لوگ اس بات کا اعلان کر ہی دیں گے یہ زبان بھی بہت بیہودہ ہے لیکن اگر یہ زبان اس کے بعد زندہ رہی تو اس میں غزل کے شعر گونجتے ہی رہیں گے۔" (7)

غزل آج جس مقام پر کھڑی ہے اس کے پیچھے صدیوں کا سفر موجود ہے جس نے غزل کو الگ شناخت فراہم کی ہے۔ نت نئے جہانوں کا کھوج اور رنگارنگی نے غزل کو وسعت بخشی ہے۔ ہر شاعر کا اپنا ایک الگ فکری میدان ہوتا ہے جس کی وسعت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ غزل کی وسعت کے سلسلے میں بات کریں تو

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غزل صرف غزل ہی نہیں بلکہ ایک انداز فکر اور سلیقہ اظہار ہے۔ اس کے ذریعے ہر صنف سخن کو غزل میں سمویا جا سکتا ہے۔ اس میں شعری اصناف کے جتنے انداز پائے جاتے ہیں وہ کسی دوسری زبان میں نہیں مل سکتے۔ اس میں اتنی گنجائش ہے کہ ہر طرح کے فکری افکار کو اس کا موضوع بنایا جا سکتا ہے۔ غزل اردو شاعری کی قدیم ترین صنف ہے۔ اردو شاعری میں یہ صنف وقت کے تغیر کے ساتھ ساتھ مختلف مدارج طے کر کے اپنے مخصوص پیرائیہ اظہار میں داخلی اور خارجی پہلوؤں کی ترجمانی اور عکاسی کرتی رہی ہے۔ جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے تو غزل میں ہر طرح کے موضوعات داخل کیے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر خواجہ اکرام موضوعات کے بارے میں لکھتے ہیں:

"غزل میں عشق، معاملات و کیفیات اور وارداتِ عشق کے علاوہ انسانی زندگی کے مسائل دنیا کی بے ثباتی اور اہل دنیا کج روی، زمانے کے حالات، انفرادی و اجتماعی زندگی کے تجربات اور تصوف و اخلاق، نفسیات انسانی کے نکات و اشارات، تمدن و معاشرت کے اصول و معاملات جیسے تمام مضامین شامل ہیں۔" (8)

غزل کے موضوعات میں رنگارنگی اور تنوع پایا جاتا ہے۔ اس میں زندگی کے تمام پہلوؤں کو سمویا جا سکتا ہے چاہے اس کا تعلق داخلی معاملات سے ہو یا خارجی معاملات سے۔

کلاسیکی عہد اور میرؔ و سوداؔ کی غزل:

میر و سودا کے دور کو اردو غزل کا سنہری دور کہا جاتا ہے۔ اس دور میں شاعری کو عروج حاصل ہوا اور تمام اصناف ترقی کر کے کہاں سے کہاں پہنچ گئیں۔ ہماری زبان کی مقبول ترین صنف شاعری ہے۔ اردو شاعری غزل کے بغیر ادھوری ہے۔ یہ ہماری زبان اور تہذیب کا قیمتی سرمایہ ہے۔ میر کی شاعری اگر آہ ہے تو سودا کی شاعری واہ ہے۔ میر تقی میرؔ نے شاعری میں دہلی اور اس کے غم کو بیان کیا ہے۔ کیونکہ اس دور میں سیاسی بد نظمی نے معاشرتی اور اخلاقی نظام کو روند کر رکھ دیا تھا لہذا یہ دور بے چینی اور بے یقینی کا دور تھا۔ پورا معاشرہ افسرگی کا شکار تھا جسے میر تقی میر نے شاعری میں پرو کر بیان کیا۔ ان کی شاعری سادگی کا حسین مرقع ہے کیونکہ انہوں نے شاعری کے لیے سادہ زبان استعمال کی۔ ان کی شاعری داخلیت اور خارجیت کا حسین امتزاج ہے۔ اس سے دہلی کی تہذیب و تمدن کا کھل کر اظہار ہوا۔ انہوں نے سادہ زبان استعمال کر کے شاعری کو عوام کے ساتھ جوڑ دیا۔ ڈاکٹر کامل قریشی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"میر کے کلام کی دل آویزی کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ وہ اپنے واردات اور
حالات کو اپنے پر تاثیر، دلنشین اور انوکھے انداز میں بیان کرتے ہیں کہ ایک عالم
چھا جاتا ہے اور بات دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ ذرا دہلی کی تباہی، بربادی اور پیہم
حملوں پر غور کیجیے اور یہ شعر پڑھیے۔

اب جہاں آفتاب میں ہم ہیں
یاں کبھی سرو گل کے سائے تھے

ملاحظہ فرمائیے اس شعر میں کتنی معمولی بات کہی گئی ہے۔ لیکن کتنے سادہ بلیغ اور
موثر انداز میں۔"(9)

سودا نے اپنے عہد میں لکھنؤ کی معاشرت کی عکاسی کی ہے۔ لکھنؤ خوشحالی کا گڑھ تھا۔ دہلی سے ہجرت کرنے والے بہت سے علما اور ادبا نے یہاں قیام کیا اور شاعری کو عمدہ رنگ دیا۔ اس شاعری میں نشاطیہ عنصر غالب تھا۔ سودا نے اپنے قصائد کے ذریعے لکھنؤ کی پر امن زندگی اور خوشحالی کی عکاسی کی ہے۔ تصوف اور عشق اس دور کے تقریباً ہر شاعر کی رگ رگ میں بس چکا تھا بلکہ تصوف اور عشق اس دور کی شاعری کا حصہ تھا۔ اس دور کی غزل میں درد، ہجر، نارسائی، فراق اور جفائے عشق کی کثرت ہے۔ یہی عشق خدا تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ اسی دور میں میر درد نے بھی اردو غزل کو نئے منصب سے آشنا کیا۔ ان کے ہاں عشق اعلیٰ جذبہ ہے جس کے ذریعے انسان خدا تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ انہوں نے شاعری کے ذریعے تصوف کے مختلف مسائل و کیفیات کو عشقیہ اسلوب میں بیان کیا۔ تصوف، عشق اور تہذیب اس دور کی خاص پہچان ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر جمیل جالبی یوں رقمطراز ہیں:

"عشق اس دور کا بنیادی رویہ ہے۔ یہ دور اپنے ظاہر و باطن کا اظہار اسی حوالے سے
کرتا ہے۔ ظاہر کے اظہار کو عشق مجازی اور باطن کے اظہار کو عشق حقیقی کا نام دیتا
ہے۔ لیکن دونوں کے اظہار کے لئے علامات و اشارات ایک سے استعمال کرتا
ہے۔ اس لیے مجاز و حقیقت ایک ہی پیرائے میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ جن علامات
کے ذریعہ درد نے اپنے تجربات و واردات کا اظہار کیا ہے انہیں علامات کے ذریعہ
میر اور سودا نے اپنے تجربات کا اظہار کیا ہے۔" (10)

اس دور کی غزل ملا خیالی، ولیؔ دکنی، سید میراں ہاشمی، مرزا عبدالقادر بیدلؔ، سراج الدین خان آرزوؔ، میر عبدالحئی تاباںؔ جیسے شعرا سے ہوتی ہوئی میرؔ و سوداؔ کے دور میں داخل ہوئی۔ میرؔ و سوداؔ کے دور کے شعرا میں

میر تقی میرؔ، خواجہ میر دردؔ، مرزا محمد رفیع سوداؔ، خواجہ حیدر علی آتشؔ، شیخ امام بخش ناسخؔ، قلندر بخش جرآت اور مرزا اسد اللہ خان غالبؔ کے نام قابل ذکر ہیں۔

غالبؔ، حالیؔ اور اقبالؔ کی غزل:

جنگ آزادی (1857ء) کے بعد مغلیہ اقتدار کا خاتمہ ہوا اور برصغیر پاک وہند پر انگریز قابض ہو گئے۔ اس خطے کی سیاست کے ساتھ ساتھ اس دور میں دہلی اور لکھنؤ دونوں مراکز میں شاعری بھی درہم برہم ہو گئی۔ شعرا بھی دوسرے لوگوں کی طرح بھٹکتے پھرتے اور جہاں جگہ ملتی سکونت اختیار کر لیتے۔ اس انتشار کے بعد جب شعرا نے دوبارہ ہوش سنبھالا تو انہوں نے اپنی شاعری کا رخ مقصدیت کی طرف موڑا۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب اس دور کے خاتم اور نئے دور کے پیش رو تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری کا آغاز فارسی سے کیا۔ فارسی سے انہیں خاص رغبت تھی۔ اسی لیے ان کی ابتدائی شاعری پر فارسی کا غلبہ ہے۔ انہیں اپنی فارسی گوئی پر ناز تھا لیکن پھر بھی انہوں نے اردو غزل کو لازوال دولت دی۔ غالب نے روحانیت اور فلسفہ کو شاعری میں سمو دیا۔ کہیں سر مستی و رندی کے راگ الاپتے نظر آتے ہیں۔ غالب کے ہاں فکر و فن کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ وہ وحدت الوجود نظریہ کے قائل تھے لیکن اپنی آزاد خیالی کے باعث وہ تصوف سے کئی قدم آگے نکل گئے ہیں۔ ان کی شاعری ہمہ رنگ انسان کی شاعری ہے۔ ان کی شاعری میں حسن و عشق کے احساسات و جذبات، فلسفہ و تصوف اور تہذیب و معاشرت کے مسائل کا بیان ملتا ہے۔

مولانا الطاف حسین حالیؔ نے اپنی مسدس " مدو جزر اسلام " لکھ کر مسلمانوں میں اصلاح کی ایک نئ روح پھونک دی۔ ادب کی دوسری اصناف کی طرح غزل میں بھی محض حسن و عشق اور ہجر و وصال کے قصے بیان کرنے کی بجائے اس میں ایسے موضوعات شامل کیے جس سے قوم میں تحریک پیدا ہو اور ان کی اصلاح ہو سکے۔ حالی نے اپنی غزلیہ شاعری میں بھی حسن و عشق کے نازک جذبات اور احساسات کے ساتھ ساتھ قومی، سیاسی اور تہذیبی موضوعات کو زیادہ جگہ دی۔ انہوں نے اپنی قوم کو بتایا کہ ہماری سابقہ غزلیہ شاعری جو کہ محض حسن و عشق اور جذبات کا اظہار ہے اسے ہمیں ترک کرنا پڑے گا۔ ہمیں اپنی شاعری کو مقصدیت پر لاتے ہوئے اپنی اور اپنی قوم کی اصلاح کرنی ہو گی۔ اسی میں ہماری فلاح ہے۔ اس دور میں اقبال نے بھی اپنی غزلیہ شاعری سے سوئی ہوئی قوم کو جگایا۔ انہوں نے اپنے فلسفہ خودی، فلسفہ حرکت و

عمل اور فلسفہ عشق سے قوم میں حرکت پیدا کی۔ قوم کو اسلاف کے کارنامے یاد دلا کر اس کے اندر حرکت و عمل کی ایک لہر دوڑا دی اور بتایا:

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبح گاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی
تری زندگی اسی سے، تری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی , نہ رہی تو رو سیاہی
یہ معاملے ہیں نازک , جو تری رضا ہو تو کر
کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریقِ خانقا ہی(11)

اس دور کے معروف شعرا میں علامہ اقبالؔ، خواجہ الطاف حسین حالیؔ، اکبرؔ الہ آبادی، ذاکرؔ حسین، ثاقبؔ لکھنوی، سیمابؔ اکبر آبادی، فانیؔ بدایونی، اصغرؔ گونڈوی، یاس یگانہؔ چنگیزی، فراقؔ گورکھپوری، جوشؔ ملیح آبادی، اخترؔ شیرانی اور احسان دانش شامل ہیں۔

ترقی پسند دور اور اردو غزل:

ترقی پسند تحریک کا آغاز 1936ء میں ہوا۔ اس دور میں تمام اہم غزل گو شعرا نے ترقی پسند تحریک میں حصہ لیا اور اس سے وابستہ ہو گئے۔ اصل میں اس سے پہلے ہی ترقی پسند تحریک کی راہ ہموار ہو چکی تھی۔ ہندوستان میں 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد ایک نئے دور کا آغاز ہو چکا تھا۔ غدر کے بعد ہندوستان میں لوگوں کے اندر سیاسی اور معاشرتی بیداری کا عمل شروع ہو گیا۔ ہندوستان میں انگریزی تعلیم عام ہوتی گئی جس نے بیداری کے اس عمل کو مزید تیز کر دیا۔ یہاں مختلف علمی و ادبی اور سیاسی تنظیموں نے جنم لیا۔ جن میں علی گڑھ تحریک، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ شامل ہیں۔ اس سے پہلے ہی مولانا الطاف حسین حالیؔ اور محمد حسین آزادؔ نے شاعری کو بامقصد اور حقیقی بنانے کے لیے کوششیں شروع کر دی تھیں جس کی وجہ سے لوگوں کا رجحان غزل کی بجائے نظم کی طرف زیادہ ہو چکا تھا۔ اس دور میں غزل گوئی ثانوی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ اس سلسلے میں خلیل الرحمن اعظمی لکھتے ہیں:

" اردو شاعری کی سب سے اہم صنف غزل جس میں طبع آزمائی معیاری شاعر ہونے کی دلیل تھی اب اس کی حیثیت ثانوی سی ہوتی جا رہی تھی۔"(12)

ترقی پسند تحریک بہت تیزی سے مقبول ہوئی کیونکہ اس کے حامیوں نے مزدوروں، کسانوں اور درمیانے طبقے کے حقوق کی بات کی۔ اس وجہ سے اس کی آواز پورے ملک میں پھیل گئی۔ اس تحریک نے ادب اور شاعری میں بھی حقیقت پسندی کے رجحان کو بڑھایا اور ایک ادیب اور شاعر کی معاشرتی ذمہ داریوں پر بہت زور دیا۔ وہ ادب اور شاعری میں اخوت و مساوات، جمہوریت، انسانیت، اخلاقی اقدار اور معاشرتی ناہمواری کے خیالات کی ترویج و تبلیغ اور اشاعت کی علمبردار تھی۔ آہستہ آہستہ ترقی پسندوں نے اس تحریک کو مارکسیت کے اغراض و مقاصد کی ترویج تک محدود کر دیا۔ غزل اردو ادب میں ایک روایتی صنف سخن کا درجہ رکھتی تھی اور اس میں عشق و تصوف کے موضوعات ازل سے چلے آرہے تھے جن کا تعلق ایک خاص طبقے سے تھا۔ اس کے برعکس ترقی پسند تحریک ایک عوامی تحریک تھی اور عوام کے حقوق و خیالات کی ترجمانی کرتی تھی۔ اس لئے انہوں نے غزل کو جاگیردارانہ عہد کی نشانی سمجھا اور اس کی مخالفت کی لیکن اپنی اس کوشش میں وہ بہت حد تک ناکام رہے۔ ہر نئی تحریک کی طرح ترقی پسند تحریک بھی شدت اور انتہا پسندی کی وجہ سے جلد انتشار کا شکار ہو گئی۔ غلام آسی رشیدی لکھتے ہیں:

> "اپنی ابتدا کے ساتھ ہی یہ تحریک شدت پسندی اور انتہا پسندی کی شکار ہو گئی۔ چونکہ اس تحریک کا خمیر روسی انقلاب سے بنا تھا۔۔۔ یہ عہد ایک ایسا ہنگامی دور تھا کہ ایک آواز پر پورا زمانہ لبیک کہنے پر آمادہ تھا۔ بھیڑ چال کی عادت کے تحت کئی ترقی پسندوں نے اردو غزل کو تنگ دامن مان کر اس کی گردن زنی کا فیصلہ صادر کر دیا۔ لیکن ان کے دوسرے کئی نعروں کی طرح غزل کی مخالفت کا یہ نعرہ بھی کھوکھلا ثابت ہوا۔"(13)

ہندوستان کی آزادی اور برصغیر کی تقسیم کے بعد دوسرے شعرا کی طرح ترقی پسند شعرا بھی تقسیم ہو گئے۔ اس طرح ترقی پسند تحریک کا زور خود بخود ختم ہو گیا مگر غزل اپنے جدید رنگ و آہنگ اور اسلوب کے ساتھ اپنی رنگینیاں بکھیرتی رہی۔ ترقی پسند غزل گو شعرا میں فیضؔ اور مجروحؔ کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ انہوں نے کلاسیکی غزل کی ان علامتوں کو شاعری کا حصہ بنایا جن میں سیاست پائی جاتی تھی۔ سیاسی اشاریت کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں رمزیت بھی پائی جاتی ہے۔ انہوں نے شاعری کے ذریعے لوگوں میں بغاوت کا عنصر سمویا۔ ہندوستان کی تقسیم اور قیام پاکستان کے بعد فیضؔ کا مجموعہ کلام "دست صبا" شائع ہوا تو عوام میں غزل ایک دفعہ پھر مقبولیت حاصل کر گئی۔ اس سلسلے میں خلیل الرحمن اعظمی لکھتے ہیں:

"دست صبا کی مقبولیت کے بعد شاہراہ گروپ کے شعرا بین الاقوامی اور عالمی
مسائل کی نظمیں چھوڑ کر غزل گوئی کی طرف آ گئے۔"(14)

ترقی پسند عہد کے غزل گو شعرا میں اسرار الحق مجازؔ، پرویز شاہدیؔ، فیض احمد فیضؔ، معین احسن جذبیؔ، سردار جعفریؔ، غلام ربانی تاباںؔ، اخترؔ انصاری، احمد ندیمؔ قاسمی، مجروحؔ سلطان پوری اور قتیلؔ شفائی کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ ان شعرا نے غزل میں اپنا منفرد رنگ پیدا کیا اور پابندی کے ساتھ غزل کہتے رہے۔

ترقی پسند تحریک کا آغاز جس دور میں ہوا اس سے ذرا قبل غزل پر رومانیت چھائی ہوئی تھی۔ جس کا اثر ابتدائی ترقی پسند غزل گو شعرا مجاز اور جذبی وغیرہ کے ہاں صاف طور پر نمایاں ہے۔ ان کے ہاں فکر کی تابنا کی ملتی ہے جو انہیں دوسرے شعرا سے ممتاز کرتی ہے غزل کی جڑیں برصغیر میں اس قدر مضبوط ہیں کہ آج کئی صدیاں گزر جانے کے بعد بھی غزل اپنی پوری آب و تاب سے زندہ و جاوید ہے ۔ در حقیقت غزل ، غزل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نقطۂ نظر ، سلیقہ اور اظہار بھی ہے ۔ اس میں قلبی واردات کے ساتھ ساتھ دلی احساسات و جذبات کے اظہار اور مشاہدے سے بھی کام لیا جاتا ہے۔

جدید غزل کا دور:

ترقی پسند تحریک کا دور 1936ء سے لے کر تقریباً 1960ء تک رہا۔ یہ تحریک یہاں تک آتے آتے جس تیزی سے پروان چڑھی تھی اسی تیزی سے زوال پذیر ہو گئی۔ اس کے بعد اردو ادب میں ایک نئی شاعرانہ فضا قائم ہوئی۔ شعرا نے اپنی ذات اور شاعری کو کسی خاص نظریے سے وابستہ کئے بغیر آزادی سے اپنے عصری مسائل کو نئے انداز اور اسلوب سے پیش کیا۔ حالی کے اصلاحی مشوروں کے نتیجے میں جو غزل آئی اسے جدیدیت کا نام دیا گیا۔ اس نئی غزل کو اکثر جدید غزل ہی کہا جاتا ہے۔ ادبی دنیا سے وابستہ لوگ موجودہ ترقی پسند تحریک کے نعرے بازیوں سے دلبر داشتہ ہو چکے تھے اور آزادی کی فضا میں سانس لینا چاہتے تھے۔ مظفر حنفی اس بارے میں لکھتے ہیں:

"اس دور کے شعرا ترقی پسند تحریک کی غلط نوازیوں اور نعرے بازیوں سے بیزار
ہو چکے تھے اور ہر قسم کی گروپ بندی اور ذہنی جکڑن سے بالاتر ہو کر کھلی فضا میں
شعر کہنا پسند کرتے تھے۔"(15)

مغربی اصطلاح ماڈرن ازم (modernism) کے نام پر اس جدید ادبی و شعری رجحان کو جدیدیت کہا گیا۔ یہ ایک ایسا وسیع اور ہمہ گیر دائرہ تھا جس میں پوری دنیا سمٹ آئی تھی۔ یہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ جدید

تصورات کو ہر شعبہ زندگی پر فوقیت اور ترجیح ہونی چاہیے۔ اصل میں ادب میں جدیدیت کا رجحان ترقی پسند تحریک اور اشتراکیت کے انتہا پسندانہ رویے کے رد عمل کے طور پر پیدا ہوا۔ یہ نظریہ جدیدیت اپنے عہد کے فلسفوں اور تحریکوں سے متاثر ہوتا رہا۔ اس طرح 1960ء سے لے کر نصف بیسویں صدی تک کی شاعری کو نئی شاعری کے زمرے میں شمار کیا جاتا ہے۔ یوں جدید غزل بھی اسی شاعری کا حصہ ہے جس میں کسی شاعر کا مزاج، اس کے محسوسات و تجربات اور اس کی انفرادیت کا نمایاں پہلو نظر آنے لگا۔ یہ غزل تھی جو انقلابی غزل، رومانوی غزل اور ترقی پسند غزل کی گروہی چھاپ سے جدا اور آزاد ہو کر اپنی ایک الگ پہچان رکھتی تھی۔ اجتماعی اور گروہی شعور کی جگہ ذاتی شعور سے کام لیا جانے لگا۔ معاشرے اور شاعری میں ایک فرد کی حیثیت کا احساس قائم ہوا۔ ہر شاعر اپنے ماحول اور ذات کو اپنے نقطہ نظر سے دیکھتا اور شعر کہتا۔ اس کی غزل اس کے اپنے خیالات کی عکاس ہوتی اور اس میں وہ اپنی زندگی کے منظر نامے کی تصویر کشی کرتا۔ غلام آسی رشیدی لکھتے ہیں:

> "الغرض نئی شاعری نصف بیسویں صدی یا تقریباً 1960ء کے آس پاس وجود میں آئی جسے جدید شاعری کہا گیا۔ نئی غزل بھی اسی شاعری کی شاخ ہے جس میں شاعر کی انفرادیت، اس کا مزاج اور اس کے تجربات و محسوسات نمایاں ہوئے۔ وہ انقلابی غزل، رومانی غزل، اور ترقی پسند غزل جیسی گروہ بندی سے آزاد ہو کر کھلی فضا میں سانس لینے لگی۔ نئی غزل نے پہلی بار یہ محسوس کرایا کہ اس کی دنیا لامحدود ہے۔"(16)

جدید غزل میں نئی فکر، نئے موضوعات، جدتِ اسلوب اور جدتِ ادا شامل تھی۔ اس دور میں غزل کی شناخت، اس پر تنقید و تحقیق اور مزاج شناسی کا رخ تبدیل ہو گیا۔ اس کے لیے نئے پیمانوں کا تعین کیا جانے لگا۔ قدیم روایات سے روگردانی اور انحراف کیا جانے لگا اور زندگی کے نئے تقاضوں سے غزل کو ہم آہنگ کیا جانے لگا۔ ہر شاعر اپنی غزل میں اپنے احساسات و خیالات کی ترویج کے لیے نئے استعارات و تشبیہات اور نئی علامات استعمال کرتا۔ جس سے نئے جمالیاتی اشاروں، استعارات اور کنایوں کا نظام عمل میں آیا۔ انہی جدید خیالات و احساسات اور علامتوں کی حامل غزل کو جدید غزل کا نام دیا گیا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> "چونکہ جدید غزل جدید تر ذہنی کیفیات اور طرز احساس کی پیداوار ہے اس لیے اس غزل میں ہمیں ایک نئی فضا اور ایک نیا ذائقہ ملتا ہے۔ اس غزل میں پرانی

علامتوں کی تکرار اور گھسے پٹے تلازموں کی بجائے تازہ علامتیں ہمیں ہر جگہ زندہ اور محسوس شکل میں دکھائی دیتی ہیں۔"(17)

کسی بھی چیز کی حدود توڑنے سے نقصان ضرور ہوتا ہے لیکن اس سے اس کی وسعت اور اس میں تجربات کرنے کی گنجائش میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس دور میں اردو غزل کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ ان تلازمات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اردو غزل میں حسن و عشق کا معیار بھی تبدیل ہو گیا۔ جب یہ صورتحال تبدیل ہو گئی تو غزل کی عورت وہ عورت نہیں رہی جو پردہ نشین تھی اور نہ ہی بالاخانے کی وہ غیرت ناہید جس کی ہر تان پہ شعلہ سا لپک جائے۔ پھر عشق اور اظہارِ عشق بھی ویسا نہیں ہو سکتا اس لئے اس دور کا تصورِ عشق ماضی سے مختلف تھا۔

ترقی پسند تحریک جس تیزی کے ساتھ پروان چڑھی تھی اسی تیزی کے ساتھ اپنے ادبی معیاروں کی بنا پر منتشر ہو گئی۔ تقریباً نصف بیسویں صدی کے آس پاس اردو ادب میں ایک نئی شاعری کا آغاز ہوا۔ اس نئی شاعری نے کسی ایک نظریے کی وابستگی کی شرط کو ختم کیا اور فن کار کی آزادی کا احترام کرتے ہوئے نئی حسیت، عصری مسائل اور ہیئت و فن کے تجربات کے لئے راہ ہموار کی۔

جدید غزل میں جدید فکر جدید اسلوب اور جدید انداز شامل ہو گئے۔ غزل کی شناخت کے پیمانے بدل گئے۔ قدیم روایتی رویوں سے انحراف ہوا۔ زندگی کے نئے تقاضوں کی راہیں ہموار ہوئیں۔ اجتماعی شعور کی جگہ ذات کے شعور کو فوقیت حاصل ہوئی۔ نئی غزل نے محسوس کیا کہ اس کی دنیا لا محدود ہے۔ ہر قسم کے جدید تصورات کو زندگی کی ہر سطح پر فوقیت دی جانی چاہیے۔ یوسف خواجہ جمال لکھتے ہیں:

"وسیع تر معنوں میں جدیدیت کے معنی یہ رہے ہیں کہ ہم عصر یا جدید رجحانات و میلانات کو روایتی / قدیم انداز پر زندگی کے ہر شعبہ میں فوقیت دی جانی چاہیے۔"(18)

نئی غزل بھی اسی شاعری کی شاخ ہے جس میں شاعر کی انفرادیت، اس کا مزاج اور اس کے تجربات و محسوسات نمایاں ہوئے۔ وہ انقلابی غزل، رومانوی غزل اور ترقی پسند غزل جیسی گروہ بندی سے آزاد ہو کر کھلی فضا میں سانس لینے لگی۔ نئی غزل نے پہلی بار یہ محسوس کرایا کہ اس کی دنیا لا محدود ہے۔ حالی کے اصلاحی مشوروں کے نتیجے میں جو غزل منظر عام پر آئی تھی اسے جدید غزل کا نام دیا گیا تھا۔ نئی غزل کو بھی اکثر جدید

غزل ہی کہا جاتا ہے۔ اس طرح یہ نظریہ کارفرما تھا کہ جدید غزل وہی ہے جس میں آج کے انسان کے احساسات ہوں۔

جدید غزل میں جدید فکر، جدید اسلوب اور جدید ادا شامل ہو گئی۔ غزل کی شناخت کی مزاج شناسی کے پیمانے بدل گئے۔ قدیم روایت سے انحراف اور زندگی کے نئے تقاضوں سے رابطے استوار کیے جانے لگے۔ اجتماعی شعور کی جگہ انفرادی شعور کارفرما ہوا۔ فرد کی اہمیت کا احساس قائم ہوا۔ جدید شاعر اپنی ذات اور اپنے ماحول کو اپنی نگاہ سے دیکھتے ہوئے شعر کہتا ہے۔ اس کی غزل اس کے اپنے ذہن اور زندگی کا عکس بن گئی۔ شہر در شہر کی صورت اختیار کرتی ہوئی صنعتی و تجارتی آبادیوں میں آج کا شاعر اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرتا ہے۔ اسی لئے اس کی غزل میں وطن اب کوئی علامت نہیں۔ اس کی جگہ وطن میں بے وطنی کے احساس نے لے لی۔ تنہائی کا احساس جدید غزل کے اکثر شعرا میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ نئی غزل میں تردد اور بے چینی کے احساس کے ساتھ نئے استعارات و تشبیہات اور نئی علامتوں سے ہمارے اپنے دور کی تصویریں بنتی ہیں۔ آج کی غزل کا لہجہ فرد کے احساس کی شدت، تجزیے کی صحت اور جذبے کی طاقت سے عبارت ہے جس میں نئے جمالیاتی اشاروں، کنایوں اور استعاروں کا نظام قائم ہے۔ جدید غزل کے ابتدائی نقوش فانی، اصغر، جگر، حسرت اور خاص طور سے یگانہ، شاد، عارفی اور فراق کے یہاں ملتے ہیں۔ یہ شعرا نئی غزل کے پیش رو کہلاتے ہیں۔ ان شعرا کی نفسیاتی پیچیدگیوں کے اثرات نئی غزل پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

جدید غزل گو شعرا نے غزل کی قدیم روایت سے نہ صرف بغاوت کی بلکہ اس میں اپنے مردانہ لہجے، زندگی کی حرکت اور توانائی پرو کر ایک نئی روح پھونکی۔ غزل کے روایتی فرسودہ ڈھانچے کو توڑ کر اسے اپنے ماحول اور معاشرے سے ہم آہنگ کیا۔ یہ عہد ساز شعرا تھے۔ ان کے بعد آنے والے ہر شاعر نے اور خاص طور سے آج کے عہد کی نئی غزل کے شعرا نے ان سے فیض حاصل کیا۔

ناصؔر کاظمی:

ناصؔر کاظمی کا شمار پاکستان کے ابتدائی جدید غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی شاعری زوال آمادہ تہذیب سے تعلق رکھتی ہے۔ جہاں پر انسانی اقدار دم توڑتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان کی غزل میں نئے حالات اور موضوعات کا شعور ملتا ہے۔ ان کی غزل میں میر جیسے درد کی لہر پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری میں غالب کی سی

رنگار نگار نگی موجود ہے، اس میں ایک نیا عاشقانہ انداز اظہار ہے جو انہیں دوسرے شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔
ان کی غزل گوئی کے بارے میں شمس الرحمن فاروقی لکھتے ہیں:

"ناصر کاظمی کا اسلوب ایک انتہائی اچھوتا اسلوب تھا۔ اگر اس پر میر کا پرتو ہے تو غالب کا انعکاس بھی ہے۔ میر اور غالب اور انکے واسطے سے فانی کی جھلک ان کے کلام میں نظر آتی ہے۔ لیکن یہ محض ایک جھلک ہے اس سے زیادہ نہیں۔ مجموعی طور پر اپنے بہترین لمحات میں ناصر کاظمی ہماری غزل کے گنے چنے دو ایک اور یجنل شاعروں میں سے ایک ہیں" (19)

ناصر کاظمی نے اپنی شاعری میں زبان، لہجے، تجربے اور احساس کو ایک نیا انداز اور نئی فضا کے ساتھ پیش کیا جس کی وجہ ناصر کی غزلوں میں ایک نیا پس منظر کا پایا جانا تھا۔ اسی وجہ سے ناصر کاظمی کی غزلوں کو ایک الگ پہچان ملتی ہے۔

پروین شاکر:

پروین شاکر نئی غزل کی اہم شاعرہ ہیں۔ انہوں نے نئی غزل میں اپنا نام پیدا کیا ہے۔ انہوں نے پہلی مرتبہ نسوانی جذبات و احساسات کو انفرادیت کے ساتھ اپنی غزلوں کا حصہ بنایا۔ انہوں نے سب سے پہلے عورتوں کے جذبات و احساسات، جسمانی قوتوں، پریشان کن جذبوں اور دکھوں کا بے باکانہ انداز میں اظہار کیا ہے۔ بہت سی شاعرات ان سے متاثر ہو کر شاعری کر رہی ہیں۔ ان کی شاعری میں نسائی لب و لہجہ پایا جاتا ہے۔ انہوں نے جذبات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی شکست وریخت کو شاعری میں پیش کیا ہے جس کے لیے انہوں نے سادہ زبان استعمال کی ہے۔ ان کی شاعری کا خاص موضوع عشق و محبت ہے۔ انہوں نے غزل کے ذریعے ایک جوان لڑکی کے جذبات و احساسات کی ترجمانی لفظی تازگی اور تلازمہ کاری کے ساتھ کی ہے جس کی اب تک اردو غزل میں اور کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس بارے میں نظیر صدیقی لکھتے ہیں:

"لڑکی یا عورت کے محسوسات و معاملات جس حد تک، جتنی خوبصورتی کے ساتھ اور جتنے دل کش انداز میں پروین شاکر کی بدولت غزل میں آ گئے ہیں اتنے کسی اور شاعرہ کی بدولت کبھی نہیں آئے۔" (20)

انہوں نے نسوانیت کو موضوع سخن بناتے ہوئے عورتوں کے معاملات اور نازک مزاجی کو خوبصورتی سے اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ ان کی شاعری میں عورتوں کے احساسات و جذبات کا عمدگی سے بیان ملتا ہے۔

مابعد جدید غزل:

اردو غزل میں جدیدیت کے آغاز کے بعد تقریباً بیس سالوں تک وجودیت، انفرادیت اور جدت کا بول بالا رہا۔ اس کے بعد جو غزلیں ڈھلنی شروع ہوئیں ان میں ایک واضح تبدیلی ابھرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان غزلوں نے اسلوب، مواد اور خاص طور پر نقطہ نظر کے تعلق سے جدیدیت سے الگ ایک واضح شناخت قائم کی۔ بیسویں صدی کی اخیر دو دہائیوں سے اکیسویں صدی میں داخل ہو کر ارتقا کی طرف گامزن ان غزلوں کو "مابعد جدید غزل" کا نام دیا گیا۔

مابعد جدیدیت کے شعرا نے غزل کے صنفی تقاضوں کا لحاظ رکھتے ہوئے نہ صرف اپنے ثقافتی ورثہ کی طرف توجہ کی بلکہ ان کے یہاں شخصی، داخلی وابستگی پر اصرار کے ساتھ نمائندہ مذہبی کرداروں سے خود کی پہچان کرنے کا واضح رجحان جمالیاتی تجربوں اور موجودہ تہذیب میں رائج عام سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی رویوں کا اظہار بھی ملتا ہے۔ مابعد جدید غزل نہ تو ترقی پسند ہے اور نہ ہی جدیدیت پسند لیکن وہ ان دونوں سے اچھوتی بھی نہیں۔ آج کی غزل میں سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی افکار و تصورات کے ساتھ فرد کی اہمیت اور جمالیاتی خصوصیات نے وسعت اور تنوع کی خوبی پیدا کر دی۔ مابعد جدید غزل ایک مصفا و مجلا آئینہ ہے جس میں موجودہ معاشرے کی حرکت اور شاعر کا چہرہ نمایاں نظر آتا ہے۔ کوثر مظہری لکھتے ہیں:

> " آج کی شاعری صاف ستھری ناترسیلیت کے نقص سے دامن بچاتے ہوئے، ابہام و علامت کی ہلکی پرت لیے ہوئے، ترقی پسندوں اور جدیدیوں کے عہد میں برتے جانے والے موضوعات و اقدار کو (جو صرف ان کے لیے مخصوص نہیں تھے) اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے اور نئی سائنسی تبدیلیوں سے آنکھ ملاتے ہوئے آگے کی طرف رواں دواں ہے۔"(21)

جدیدیت سے نئی نسل کا انحراف کلی نہیں بلکہ جزوی ہے۔ جدیدیت نے ترقی پسندی سے کلی انحراف کیا تھا۔ نظریہ ہو یا موضوعات، لفظیات ہو یا اسالیب انہوں نے ترقی پسندیت کو مکمل طور پر رد کر دیا تھا۔ جب کہ نئی نسل نے جدیدیت کے اثبات و نفی کے دھندلکے سے اپنے سفر کا آغاز کیا ہے۔ یہ دھندلکا بے یقینی کا

دھندلکا نہیں ہے۔ دراصل پیش رو رجحانات کی اچھائیوں کو اپنے منفرد انداز میں ضم کرنے کی ایک کوشش ہے۔ مثال کے لئے ترقی پسند ادب کو سیاست کا تابع جانتے تھے۔ ان سے غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے ادب کی تاریخیت کو ایک مخصوص سیاسی پارٹی تک محدود کر دیا۔ جدیدیت نے اس سے بالکل الٹ یہ دعویٰ کیا کہ ادب کا سیاست یا اجتماعیت سے کوئی لینا دینا نہیں ہے یہ تو فنکار کی ذات کا منفرد اظہار ہے۔ مابعد جدیدیت نے بیچ کی راہ نکالی۔ انہوں نے کہا کہ دنیا کا کوئی ادب آئیڈیالوجی یا اقتداریت سے خالی نہیں۔ البتہ یہ اقتداریت کسی ایک سیاسی پارٹی کے نظریے کا نام نہیں بلکہ کسی تہذیب میں رائج وہ عام سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی رویہ ہے جو افعال، افکار اور تصورات کو کنٹرول کرتا ہے۔ اس طرح مابعد جدیدیت نے ادب میں فرد کی اہمیت اور جمالیاتی خصوصیات کو بھی لازمی قرار دیا۔ اور یوں اس کا ایک سرا آئیڈیالوجی سے مربوط ہوا تو دوسرا فرد اور ذات سے جڑا رہا۔ اس صورتحال نے شعرا میں وسعت اور تنوع کی خوبی پیدا کر دی۔

ان مابعد جدید غزل گو شعرا میں ہندوستان میں احمد محفوظ، عبد الاحد ساز، نعمان شوق، فرحت احساس، سرور الہدیٰ، مہتاب حیدر نقوی، سراج اجملی، عالم خورشید، اسد بدایونی، ارشد عبد الحمید، شکیل جمالی، مشتاق، صدف اور پاکستان میں عزم بہزاد، لیاقت علی عاصم، اختر عثمان، آفتاب حسین، اقتدار جاوید، افضال نوید، خواجہ رضی حیدر، قمر رضا شہزاد، ثمینہ راجا، اختر عثمان اور سید انصر احمد ابھرتے ہوئے غزل گو ہیں۔

عالم خورشید:

محمد خورشید عالم خاں عالم 11 جولائی 1959ء کو پٹنہ بہار میں پیدا ہوئے۔ مرکزی حکومت میں ملازم ہیں۔ ان کے دو شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ عالم خورشید ایک حساس شاعر ہیں۔ جنہوں نے اپنے ذاتی تجربے کو بڑی ہی سنجیدگی کے ساتھ غزل کے فریم میں پیش کیا ہے۔ وہ عصر حاضر کے سماج کی در اندازیوں، سماجی اور معاشرتی زندگی کے بدلتے ہوئے رویوں اور زندگی کے دیگر پیچیدہ مسائل کو اپنے نجی تجربے و ذاتی مشاہدات سے گہرائی کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔ یہ احساسات عالم خورشید کے ذہن کدے میں زبردست چکا چوند پیدا کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے شعروں میں ضدیں قائم کرتے ہیں۔ اور پھر ان سے نت نئے پیکر تخلیق کرتے ہیں۔ ان کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

تاریکی میں زندہ رہنا ہم کو نہیں منظور
جگنو سا تابندہ رہنا ہم کو نہیں منظور(22)

وہ آزادی کے لیے محنت کرتے ہوئے نوجوانوں میں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ایک نئی امنگ، نئی امید اور کچھ کر جانے کا ولولہ پایا جاتا ہے۔

ثمینہ راجا:

ثمینہ راجا پاکستان کے شہر بہاولپور کے ایک جاگیر دار گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ انہوں نے بارہ تیرہ سال کی عمر میں ہی اپنی شاعری کا آغاز کر دیا تھا لیکن گھر میں خاندانی پابندیاں ہونے کی وجہ سے وہ مشاعروں میں شرکت نہیں کرتی تھیں۔ اس لیے ان کی غزلیں 1980ء کے عشرے کے بعد منظر عام پر آئیں۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ "ہویدا" کے نام سے شائع ہوا۔ اب تک ان کے 11 شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی شاعری میں معاشرے کے نامساعد حالات اور عشق و محبت کا ذکر ہے۔ ان کی شاعری میں خوشبو، جدائی، ملن، ہجر و فراق کا ذکر بڑی خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔ ان کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

زمین پر چاند تارے چاہتی ہے
محبت استعارے چاہتی ہے
یہ لڑکی پتھروں کی سوچ والی
ہواؤں کے سہارے چاہتی ہے(23)

ان کی شاعری میں عورتوں کے جذبات کی مکمل عکاسی کی گئی ہے۔ اس میں محبت و عشق کے استعارے موجود ہیں۔ محبوب کی جدائی میں ملال درد ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔

غزل مختلف فکری مراحل سے گزرتی ہوئی ہم تک پہنچی ہے۔ اس کے اولین نقوش فارسی سے ملتے ہیں۔ یہ فارسی سے ہوتی ہوئی عربی میں آئی۔ اس کے بعد یہ اردو میں منتقل ہوئی۔ یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ خواجہ مسعود سعد سلمان اردو کے پہلے شاعر تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو غزل گیارہویں صدی کی دہائی سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد خسرو نے فارسی اور اردو سے ملی جلی شاعری "ریختہ" میں طبع آزمائی کی۔ ان کی شاعری میں تصوف اور عشق و رندی کے مضامین ملتے ہیں۔ قلی قطب شاہ تک پہنچتے ہوئے اس میں فارسی تقریباً ختم ہو گئی۔ قلی قطب شاہ نے ہندوستانی تہذیب کو اپنی شاعری میں بیان کیا۔ غواصی کی غزلوں میں عشق مجازی کے ساتھ رموز باطنی کی کیفیت بھی ملتی ہے۔

نصرتی نے غزل میں عورتوں کے جذبات عورتوں کی زبان میں پیش کر کے ریختی کی وہ روایت ایجاد کی جسے بعد میں چل کر لکھنؤ میں انشا اور رنگین نے فروغ دیا۔ جس سے بوالہوسی کی بجائے عشق سے شخصیت کی

تعمیر ہوتی رہی۔ ولی کا دیوان دہلی پہنچا تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اس کے بعد باقاعدہ طور پر شمالی ہند میں اردو شاعری کا آغاز ہوا۔ ولی کے زیر اثر جو شاعری کی گئی وہ زیادہ تر غزلیات پر مشتمل تھی۔ اس کی نمایاں خصوصیت ایہام گوئی تھی۔ اس دور میں معاشرہ سیاسی زوال کا شکار ہو گیا اور اخلاقی طور پر بھی پست ہوا۔ جس کا اثر شاعری پر بھی پڑا۔ اس ایہام گوئی سے ادب کو نقصان یہ پہنچا کہ اس شاعری فائدہ یہ ہوا کہ اردو تلفظ میں ترقی ہوئی اور لوگوں کو چھان بین کے زیادہ مواقع میسر آئے۔

غالبؔ، میر تقی میرؔ، میر دردؔ اور سوداؔ نے غزل کو عروج پر پہنچا دیا۔ اس میں موضوعات کو وسعت ملی۔ غزل عشق و عاشقی کے زاویے سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آنا شروع ہو گئی۔ اس میں تصوف، عشق حقیقی اور تہذیب و تمدن کے عناصر شامل ہو گئے۔ غالب کلاسیکی غزل کے آخری دور میں تھے۔ حالی نے مقدمہ شعر و شاعری کے ذریعے غزل کی روایت پر زبردست اعتراضات کیے، غزل کی جگہ نظموں کے مشاعرے کیے اور ادب میں مقصدیت کی داغ بیل ڈالی۔ اس کے بعد غزل میں ترقی پسند خیالات کا دور شروع ہوا۔ حالیؔ، آزادؔ اور اقبالؔ کے ذہنوں میں ان تحریکات کی گونج سنائی دیتی ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے سوئی ہوئی قوم کو جگایا۔ ترقی پسند تحریک نے اردو شاعری میں جدید خیالات کو فروغ دیا۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد ترقی پسند تحریک بے مقصد ہو گئی۔ اس دوران فرقہ وارانہ فسادات اور ہجرت کے موضوعات کو شاعری میں شامل کیا گیا۔ اس کے بعد جدید غزل کا دور آتا ہے۔ اس میں ناصر کاظمی نے سماجی اتھل پتھل کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ قدیم رنگ میں پیش کیا۔ ان کی غزلوں میں میر جیسا رنگ ہے۔

جدید غزل موضوعات اور یکسانیت کا شکار بھی ہوئی۔ اس کے بعد مابعد جدید غزل سے جدیدیت کے ساتھ کلاسیکیت بھی پائی گئی۔ اس میں سیاسی، معاشی، معاشرتی، اور اخلاقی افکار و تصورات کے ساتھ فرد کی اہمیت اور جمالیاتی خصوصیات نے وسعت اور تنوع کی خوبی پیدا کر دی۔ آج کی غزل میں ہر قسم کے مضامین شامل ہیں۔ جن میں غم زندگی، غم دوراں، حیات و کائنات کا تصور، عشق و محبت، تصوف کے رنگ، معاشرتی ناہمواری، حب الوطنی، اعلی اخلاقی اقدار اور حرص و ہوس، سیاست و معیشت وغیرہ شامل ہیں۔

حوالہ جات

1 عبادت بریلوی، ڈاکٹر، شاعری کیا ہے، ادارہ ادب و تنقید لاہور، دسمبر، 1989ء، ص:12

2 عبادت بریلوی، ڈاکٹر، ادب جنس، شاعری اور لا شاعری، مشمولہ: سیپ، کراچی، شمارہ 10،747 ستمبر 1989ء ص:249

3 فراق گورکھپوری، اردو غزل گوئی، ادارہ فروغ اردو، لاہور، 1995ء، ص:49

4 شبلی نعمانی، علامہ، شعر العجم، جلد پنجم، مطبوعہ معارف اعظم گڑھ، 1921ء، ص:33-34

5 شبلی نعمانی، علامہ، شعر العجم (حصہ پنجم)، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، 2010ء، ص:21

6 ایضاً، ص:37

7 شمیم احمد، مرتب، اردو شاعری کا فن ارتقا، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، زاہد پرنٹرز، لاہور، 1977ء، ص:84

8 اکرام، ڈاکٹر، خواجہ، اردو کی شعری اصناف، شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی، 2013ء، ص:22

9 کامل قریشی، ڈاکٹر، اردو غزل، اردو اکادمی، دہلی، 2001ء، ص:96

10 جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو (حصہ اول، جلد دوم)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1992ء، ص:496

11 محمد اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (بال جبریل)، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، 2018ء، ص: 377

12 خلیل الرحمن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، 1992ء، ص:26

13 غلام آسی رشیدی، ڈاکٹر، اردو غزل کا تاریخی ارتقا، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نیو دہلی، 2006ء، ص:282

14 خلیل الرحمن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، ص:101

15 مظفر حنفی، جہات و جستجو، مکتبہ جامع دہلی، دہلی، 1982ء، ص:46

16 غلام آسی رشیدی، ڈاکٹر، اردو غزل کا تاریخی ارتقا، ص:278

17 مظفر حنفی، مرتب، جدیدیت تجزیہ اور تفہیم، مضمون خلیل الرحمٰن اعظمی، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، 1969، ص:396

18 آل احمد سرور، جدیدیت اور ادب، (مضمون، جدیدیت کیا ہے: یوسف جمال خواجہ)، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، 1969ء، ص:30

19 شمس الرحمن فاروقی، اثبات ولی، مکتبہ جامعہ، دہلی، 1986ء، ص:137

20 مشفق خواجہ، مدیر، اسلوب، تخلیقی ادب، مضمون نظیر صدیقی، شمارہ نمبر 3، 1984ء، ص:603

21 کوثر مظہری، جواز و انتخاب، 80ء اور بعد کی غزلیں، امکان انٹرنیشنل، نئی دہلی، 2001ء، ص:41

22 عالم خورشید، خیال آباد، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2003ء، ص:143

23 ثمینہ راجہ، ہویدا، مستقبل پبلیکیشنز، اسلام آباد، 1995ء، ص:36

باب سوم

سیّد انصر کی غزلوں کا فکری جائزہ "دسترس" کے تناظر میں

فکر ایک ایسا ذہنی عمل ہے جس میں انسان اپنے خیالات اور توہمات کو جھٹک کر کسی خیال، نکتے یا مشاہدے کی گہرائی میں سفر کرتا ہے۔ یہ انسانی غور وفکر کے نتیجے کا نام ہے یعنی انسان نے اس دنیا میں کس چیز پر کتنا غور وخوض کیا تو اس کے نتیجے میں اسے کیا حاصل ہوا اس رائے یا فلسفہ کو فکر کہا جاتا ہے۔

فکر اور تخیل کسی بھی تخلیق کی بنیاد مانی جاتی ہے۔ بنیاد جس قدر مضبوط ہو گی اسی قدر تخلیق مظبوط ہو گی۔ خیال کی گہرائی اور گیرائی دونوں مل کر فن پارے کو خوبصورت اور دلکش بناتے ہیں۔ ہر تخلیق کار اپنے خوبصورت خیالات کو الفاظ کی لڑی میں پرو کر انہیں شاعرانہ رنگ دیتا ہے۔ اپنے خیالات و تصورات کو شاعرانہ انداز میں پیش کرتا ہے۔ کسی بھی فن پارے کا آغاز تخیل اور فکر سے ہوتا ہے۔ فکر سے شاعری کو معاشرے میں فروغ ملتا ہے۔ شاعر اور شاعری پر ارد گرد کے حالات کسی نہ کسی صورت میں ضرور اثر انداز ہوتے ہیں۔ جن سے متاثر ہو کر شاعر ان حالات و واقعات کو شاعری کی لڑی میں پرو کر عوام کے سامنے بیان کر دیتا ہے۔ کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں جنہیں انسان محسوس تو کرتا ہے لیکن ان کا واضح اظہار نہیں کر سکتا۔ ایسے احساسات و جذبات کو بیان کرنے کے لیے شاعری بہترین ذریعہ ہے۔ شاعر کے اندر شعری صلاحیت اس کی روح کی وہ بے چینی ہے جو اسے خاموش تماشائی نہیں بننے دیتی۔ وہ بے چینی اسے مسلسل محسوسات کے مرحلے سے گزارتی ہے اور محسوس کردہ حالات و واقعات بیان کرنے تک اسے سکون میسر نہیں آسکتا۔ حساس طبعی اس فن کا لازمی جزو ہے اور اس حساسیت کا تعلق لاشعور سے ہوتا ہے۔ شاعر اسی کی بدولت دوسروں کے دکھ درد کو اپنی شاعری میں ڈھالتا ہے۔

ابتدا میں عشق و عاشقی اور عورتوں کی باتیں کرنے کو ہی غزل کہا جاتا تھا لیکن بعد میں غزل نے ترقی کی اور اس میں مختلف موضوعات شامل ہونے لگے۔ جدید شعرا نے ہر قسم کی فکر اور تخیل کو غزل کی لڑی میں پرو دیا۔ آج کی غزل میں بہت رنگا رنگی پائی جاتی ہے اور اس میں ہر طرح کے موضوعات پائے جاتے

ہیں۔ موضوعات کے ساتھ ساتھ غزل میں ہم آہنگی، تنوع اور بے ساختگی پائی جائے تو وہ غزل کو ممتاز بنادیتی ہے۔

غزل براہ راست موضوعات کو بیان نہیں کرتی بلکہ بالواسطہ اپنے خیالات کو بیان کرتی ہے۔ غزل کا انداز بیان اسے دوسری اصناف سے الگ مقام فراہم کرتا ہے۔ آج کی غزل نے بہت ترقی کرلی ہے۔ اس نے پرانی غزل کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ جس کا مقصد صرف عشق و محبت تھا۔ اس غزل میں مختلف موضوعات کو شعری سانچے میں ڈھالنا بہت آسان ہو گیا ہے۔ اس لیے تھوڑی سی کوشش سے مختلف موضوعات کو شاعری میں سمویا جاسکتا ہے۔ یہ ایک شاعر کا ہی حسن بیان اور تخیل ہے کہ وہ ایک پورے مضمون کو مختصر کر کے دو سطور میں پیش کر دیتا ہے۔ بقول ڈاکٹر ممتاز الحق:

> " غزل کے نظریات کے بارے میں بات کریں تو اس سلسلے میں ہمیں تین نظریات ملتے ہیں۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ غزل کا کوئی موضوع نہیں ہوتا۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو غزل کا موضوع صرف عشق و محبت کو مانتے ہیں۔ اس میں دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک محض جنسی محبت کو محبت مانتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کے لئے اس کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ اور وہ لوگ عشق حقیقی کو بھی اس میں شامل کرتے ہیں۔ تیسرا نظریہ یہ ہے کہ غزل کو کچھ خاص موضوعات کے حصار میں محدود نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ اس میں ہر طرح کے مضامین شامل کیے جاسکتے ہیں"(1)

اس طرح غزل مختلف موضوعات کا مجموعہ ہے۔ اس میں ہر قسم کے موضوعات کو سمویا جاسکتا ہے لیکن وہ تہذیب کے دائرے تک محدود ہوں۔

سیّد انصر دور حاضر کے ابھرتے ہوئے شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں پر مشتمل کتاب دسترس 2000ء میں شائع ہوئی۔ جسے شاعری سے لگاؤ رکھنے والوں میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ اب تک اس کے تین ایڈیشنز شائع ہو چکے ہیں۔ ہر شاعر کی طرح ان کی شاعری میں بھی بہت سے فکری عناصر پائے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری عشقِ حقیقی، عشقِ مجازی، معاشرتی مسائل اور انسانی اندازِ فکر کے گرد گھومتی ہوئی زمانے کی زبوں حالی کو بیان کرتی ہے۔

ان کی یہ کتاب "دسترس" ان کی زندگی سے درپیش واقعات، حادثات اور معاملات کی عکاسی کرتی ہے۔ اس میں انہوں نے حقیقت پسندی کا دامن تھامتے ہوئے فضول اور بے معنی افکار کو اپنی شاعری سے دور

رکھا ہے اور حقیقت و سچائی کا دامن پکڑے رکھا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے تصوف، حُسن و عشق، غم و درد، محبت و اُلفت کے ساتھ ساتھ سیاسی حالات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ ان کی شاعری میں اداسی کا عنصر پایا جاتا ہے۔ وہ زیادہ تر خاموش طبع انسان ہیں اور تنہائی پسند ہیں اس لیے ان کی شاعری میں اداسی کا پایا جانا فطری امر ہے۔ ان کی ابتدائیہ شاعری میں محبت، حزن و ملال اور غم کا عنصر پایا جاتا ہے۔ بعد کی شاعری میں وسعت پیدا ہوئی اور اس میں انسانیت کے حوالے سے دکھ، درد، غربت و افلاس، سرمایہ داروں کا ظلم، دہشت گردی، منافقت، قانون کی ناانصافی اور معاشرتی بگاڑ جیسے موضوعات شامل ہوتے گئے۔

تصوف:

سیّد انصر کی شاعری میں تصوفانہ رنگ غالب ہے۔ وہ انسان اور انسانیت کے متعلق بات کرتے ہوئے خالق حقیقی سے محبت کو بیان کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں جابجا تصوفانہ رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔ تصوف اس عمل یا طریقہ کار کو کہتے ہیں جس پر عمل پیرا ہو کر صوفیا کرام اللہ کا قرب حاصل کرتے ہیں۔ تصوف کو تزکیہ نفس اور احسان کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ یعنی اپنے نفس کو مار کر اللہ کی خوشنودی کے لیے اچھے کام کرنا اور لوگوں کے ساتھ بھلائی کا راستہ اختیار کرنا تصوف ہے۔ انسانوں سے محبت اللہ سے محبت کا سبب بنتی ہے۔ عشق مجازی سے عشق حقیقی تک کی منزل تصوف سے ہو کر گزرتی ہے۔ ہر زمانے اور ہر مذہب میں تصوف مختلف صورتوں میں اختیار کیا جاتا رہا ہے۔ مختلف مذاہب کے لوگ رب کی رضا کے لیے دنیا ترک کر کے ویرانوں میں سکونت اختیار کرتے رہے اور اسے تصوف کا نام دیا جاتا رہا۔ اسلام نے ترک دنیا کو رہبانیت کا نام دیا اور مسلمانوں کو رہبانیت سے منع کیا۔ اس طرح مسلمانوں میں یہ تصور ایک الگ انداز میں پایا جانے لگا۔ اسلام میں اللہ اور اس کے رسول سے سچی محبت اور اللہ کے بندوں سے محبت رکھنا تصوف ہے۔ حسن اخلاق کا نام بھی تصوف ہے۔ تصوف کا مسلک انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی اصلاح ہے۔ سب کے ساتھ بھلائی کرنا، غیروں سے حسن سلوک اور دوسروں کے ساتھ احسان کرنا تصوف ہے۔ پروفیسر عبدالقادر تصوف کے بارے میں یوں بیان کرتے ہیں:

"دراصل تصوف اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دینا ہے"(2)

تصوف ایک ایسے نظام کا نام ہے جس میں دل کو نفسانی آلائشوں سے پاک کر کے اس میں اخوت، محبت، رواداری، احسان، صبر و تحمل، سادگی اور سچائی جیسی صفات پیدا کی جاتی ہیں۔ انسان اپنی ذات پر

دوسروں کو فوقیت دیتا ہے۔ دشمنوں کے ساتھ بھی دوستوں جیسا سلوک کرتا ہے۔ خدا کی بنائی ہوئی مخلوق سے محبت کرتا ہے۔ انسانوں کو غم میں دیکھ کر تکلیف محسوس کرتا ہے اور ان کے غم کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ احساس آدمیت بھی تصوف کے زمرے میں آتا ہے۔ سیّد انصر تصوف کے بارے میں کہتے ہیں:

"آدمی دنیا میں رہتے ہوئے اللہ تعالی سے لو لگائے، اس کا منشور یہ ہو کہ اللہ تعالی سے دوستی کرنی ہے اور اللہ تعالی کا قرب حاصل کرنا ہے۔ وہ ظاہری طور پر دنیاوی معاملات میں بھی رہے۔ لیکن نفسانی خواہشات کی پیروی نہ کرے تو یہ تصوف ہے"(3)

جب انسان کے دل میں یہ جذبات پیدا ہو جاتے ہیں کہ خدا ہر جگہ، ہر ذرے میں موجود ہے اور وہ ہمیں دیکھ رہا ہے لیکن ہم اسے نہیں دیکھ سکتے، خدا اتنا لطیف ہے کہ ہماری نظر اس کا احاطہ ہی نہیں کر سکتی تو انسان کے اعمال میں خود بخود عاجزی آ جاتی ہے۔ یہی احساسات، تصوف میں ڈھل جاتے ہیں اور تصوفانہ رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ سیّد انصر کی شاعری میں بھی تصوف مختلف انداز میں پایا جاتا ہے۔ وہ خدا کی محبت سے سرشار ہیں ان کو ہر جگہ خدا کے جلوے دکھائی دیتے ہیں۔ شعر ملاحظہ کریں:

دیکھ پاتا نہیں ہوں کہیں بھی تجھے میں
تجھ کو موجود بھی جا بجا لکھ رہا ہوں (4)

انسانیت کی خدمت بھی تصوف میں شامل ہے۔ انسان پر جو ذمہ داری عائد کی گئی ہے اس کو نبھانا بذات خود ایک عبادت ہے۔ انسان دنیا میں رہتے ہوئے صراط مستقیم پر چلے۔ کسی کا حق نہ کھائے۔ اللہ کی عبادت کرے۔ خدا اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے طریقوں پر چلے اور ہر طرح کے صغیرہ و کبیرہ گناہوں سے بچنے کی بھرپور کوشش کرے اور بے لوث محبتیں بانٹے یہ تصوف ہے۔ عشق حقیقی کا اختیار کرنا تصوف ہے۔ سیّد انصر خدا سے محبت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

تیری حکمت ورائے حد عقل و دانش
سو تجھے بے حد و انتہا لکھ رہا ہوں (5)

شاعری میں تصوف کی ہمیشہ سے خاص جگہ رہی ہے اردو شاعری میں بھی مختلف شعرا نے مختلف انداز میں تصوف کو شامل کیا ہے۔ ان شعرا میں بابا بلھے شاہ، میر تقی میر، مومن خان مومن، مرزا غالب اور

اقبال جیسے شعر اشامل ہیں۔ اقبال نے فلسفہ خودی کو تصوف کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا۔ پنجابی کے مشہور شاعر بابا بلھے شاہ کی شاعری میں بھی تصوف کو غلبہ حاصل ہے۔ اس طرح سیّد انصر کی شاعری میں بھی مختلف انداز میں مختلف الفاظ کے ذریعے تصوف کو بیان کیا گیا ہے۔

عشق:

ہر شاعر کی طرح عشق و محبت سیّد انصر کی شاعری کا بھی اہم موضوع رہا ہے۔ وہ محبت کو ایک پاکیزہ جذبہ سمجھتے ہیں جو ہر انسان کے دل میں پایا جاتا ہے۔ محبت جب اپنے عروج پر پہنچتی ہے تو اسے عشق کا نام دیا جاتا ہے۔ عشق عربی زبان میں گہری چاہت کو کہتے ہیں جبکہ عقلی توجیہ میں ایسی بے لگام تڑپ کا نام ہے جو کسی قاعدے اور قانون کی پابند نہیں ہے۔ یہ سفر فنا سے بقا کا ہے۔ عام طور پر عشق کی دو صورتیں ہوتی ہیں مجازی اور حقیقی۔ عشق مجازی میں انسان کے مکمل وجود کی طلب اور اپنی طلب کو انسانی دائرے تک رکھنا ہے۔ اپنی خواہشات کو کسی کے تابع کرنا یعنی کسی انسان کے لیے اپنی مرضی کو ختم کر دینا عشق مجازی ہے۔ عشق مجازی میں آنکھیں، صورت، حسن اور تمام تر انسانی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ عشق آنکھوں سے شروع ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ جمال کے تمام کمالات کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ اس کے برعکس عشق حقیقی مجاز سے ماوراہو کر حقیقت کا طالب ہوتا ہے۔ اس میں وجود کی طلب نہیں رہتی۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی وہ ذات ہے جو عشق حقیقی کی مترادف ہے جبکہ مجاز میں کوئی بھی شمار ہو سکتا ہے۔ سیّد انصر عشق کے بارے میں لکھتے ہیں:

عشق نے جب بھی دیا اپنی صداقت کا ثبوت
یا سرِ دار دیا یا سرِ دربار دیا (6)

عشق میں انسان اپنے ہوش کھو بیٹھتا ہے اور محبوب کی خوشی ہی سب سے اہم ہوتی ہے۔ شاعری چونکہ قلبی واردات کا ذریعہ اظہار ہوتی ہے۔ اس لیے شاعر بڑی آسانی سے اپنے دل کی بات کو اشعار کی صورت میں ڈھال کر پیش کر دیتا ہے جبکہ وہی بات انسان سادہ الفاظ میں کہتے ہوئے ہچکچاتا ہے۔ انسان اپنی محبت کا اظہار بھی شاعری کے ذریعے خوبصورتی سے کر سکتا ہے۔ عشق و محبت کا موضوع شاعری کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ یوسف خان بھی عشق و محبت کو غزل کا اہم ترین موضوع مانتے ہیں۔ مگر وہ عشق کی وسعت کے بھی قائل ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"غزل گو شاعر کے نزدیک عشق پوری زندگی پر حاوی ہے۔ جہاں تعلق ہو گا وہاں جذبہ بھی ہو گا۔ وہاں کسی نہ کسی قسم کا تعلق ضرور ہو گا۔ جس طرح فطرت کے

مظاہر اور ان کی قوتیں علائق کی زنجیر میں بندھی ہوتی ہیں۔ اس طرح زندگی بھی
تعلقات کی سنہری ڈوریوں سے جکڑی ہوئی ہے۔ یہ تعلق فطری بھی ہے اور
معاشرتی بھی۔"(7)

جب عشق حد سے بڑھ جاتا ہے تو جنون کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ عاشق کے لیے معشوق ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ وہ اس کی رضا میں راضی ہوتا ہے۔ محبوب لاکھ ستم ڈھائے عاشق اف تک نہیں کرتا۔ قیس دیوانہ وار جنگلوں میں پھرتا اور لیلی لیلی پکارتا تھا تو کہیں سسی اور پنوں اپنا الگ ڈیرہ جمائے بیٹھے ہیں۔ کہیں سیالوں کی ہیر پر رانجھا فدا ہوتا ہے تو کہیں شیریں کی خاطر فرہاد دودھ کی نہر کھودنے میں گم نظر آتا ہے۔ یہ سب عشق کا ہی تو جنون ہے کہ انسان کو اپنی ہوش تک بھلا دیتا ہے۔

عشق کرنے والوں کے حصے میں عموماً تنہائی، راتوں کا جاگنا اور آنسو ہی آتے ہیں۔ یہ سب عشق کی سوغاتیں ہیں۔ جنہیں عاشق زار ہنس کر سہتا ہے۔ یہ عشق کا وار جب چلتا ہے تو تن، من، دھن سب جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ پل پل تڑپنا مقدر بن جاتا ہے۔ یہ چبھن اور یہ درد آنکھوں کے راستے آنسوؤں کی صورت میں رواں ہو جاتا ہے۔ عاشق زار اپنے ہی خیالوں کی دنیا میں مگن ہوتا ہے۔ اسے لوگوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

اردو کی عشقیہ شاعری میں پر خلوص آوازیں میر درد، مصحفی اور مومن کی ہیں۔ غالب کی عشقیہ شاعری بھی اہم ہے۔ داغ، حسرت موہانی کا نام بھی اس میں قابل ذکر ہے۔ عشقیہ شاعری صرف اردو شاعری کا ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کی شاعری کا بہت بڑا عنصر ہے۔ ہر زبان کی کچھ زندہ روایات ہوتی ہیں جو شعرا کی بدولت تشکیل پاتی ہیں۔ سیّد انصر عشق کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

بنائے عشق دلیلوں پہ کون رکھتا ہے
بجھے چراغ فصیلوں پہ کون رکھتا ہے(8)

عشق و محبت کوئی آسان کھیل نہیں ہے۔ اس عشق نے کئی محفلیں اجاڑی ہیں۔ کسی کو تپتے صحرا میں جلنے کے لیے چھوڑ دیا اور کسی کو سولی پر چڑھا دیا۔ یہ عشق بہت ظالم ہے۔ جہاں ثواب و گناہ کا تصور نہیں ملتا اور بدلے میں آنسو ملتے ہیں۔ یہ رنگ برنگی محفلوں کو پل بھر میں ویران کر دیتا ہے۔ عشق کی منزلوں سے آخری منزل زندگی کا اختتام ہے۔ عشق میں چارہ گری نہیں ہوتی۔ یہ تو بے چارگی کا نام ہے۔ عاشق کے بس میں کچھ نہیں ہوتا۔ وہ تو بس سر تسلیم خم رکھتا ہے اور حکم کا تابع ہوتا ہوا جی حضوری کے راگ الاپتا رہتا ہے۔ عاشق کی کوئی خواہش نہیں ہوتی۔ یوں کہا جائے تو بہتر ہو گا کہ تمنائیں تو ہوتی ہیں لیکن ان پر اپنا اختیار نہیں ہوتا۔ محبت

میں تو عقل کا ساتھ رہتا ہے جبکہ عشق میں عقل سے محرومی ہوتی ہے۔ سیّد انصر پاکیزہ عشق کے قائل ہیں۔ شعر ملاحظہ کیجیے:

وہ عشق ہی کیا ہے جو زمانے پہ عیاں ہو
وہ حسن ہی کیا ہے جو حجابوں سے نکل جائے(9)

کسی بھی ایک شخص کے لیے اپنی انا کو ختم کر دینا مجازی کے زمرے میں آتا ہے۔ عشق مجازی اور حقیقی دونوں صورتوں میں محبوب کو اہم اور بنیادی مقام حاصل ہے۔ کسی انسان سے لگاؤ ہونا محبت کے زمرے میں آتا ہے لیکن جب یہی محبت انتہا کی شدت اختیار کرتی ہے تو یہ عشق بن جاتا ہے۔ عشق میں انسان ہوس کا پجاری نہیں ہوتا بلکہ وہ محبوب کے حسن کو پاکیزہ نظروں سے دیکھتا ہے۔

حُسن:

حُسن کے معانی خوبصورتی، جمال، عمدگی، لطافت اور سجاوٹ کے ہیں۔ ہر وہ چیز حسین اور دلکش ہے جس سے محبت ہو جائے۔ اللہ تعالی خوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔ اللہ تعالی نے یہ خوبصورتی انسانوں میں بھی رکھ دی ہے۔ کوئی بھی چیز ہو یا مخلوق ہر کسی میں حسن پایا جاتا ہے۔ تاکہ انسان خوبصورتی سے لطف اندوز ہو سکے۔

انسان فطرتاً جمالیت پسند ہے اور حسن انسان کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ انسان جب کوئی پھول، انسانی چہرہ یا خوبصورت موسم دیکھتا ہے تو اس کا دل خوشی سے بھر جاتا ہے۔ خوبصورتی دیکھنے پر اس کی طرف مائل ہونا فطری سی بات ہے۔ حسن وہ جمال ہے جو اپنے اندر ایک کشش رکھتا ہے۔ انسان اس کی خوبصورتی میں کھو جاتا ہے اور اسے پسند کرنے لگتا ہے۔

اس طرح نرم دل لوگ حساس ہوتے ہیں۔ حساسیت و جمالیت جو اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو ودیعت کی ہوتی ہے اس کے ذریعے وہ ہر معمولی چیز میں بھی حسن تلاش کر لیتے ہیں۔ حسن پرست اور جمالیت پسند لوگوں کے دل میں دوسروں کے لئے ہمدردی اور محبت پائی جاتی ہے۔ ان کے دل میں انسانیت کی خدمت کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ وہ لمحات وواقعات کو بھی حسین بنانے کے درپے ہوتے ہیں۔ نرم دل انسان عمر کے کسی بھی حصے میں ہو خوبصورتی اسے ضرور متاثر کرتی ہے اور اس کے دل میں محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ سیّد انصر بھی حسن سے متاثر ہوتے ہوئے لکھتے ہیں:

جب سامنے وہ مرمریں پیکر نہیں ہوتا
پھر دید کے قابل کوئی منظر نہیں ہوتا(10)

حسن شاعری کا پسندیدہ ترین موضوع رہا ہے۔ حسن کے بنا محبت ہونا ایک عجیب سی بات ہو گی۔ یہ حسن انسانوں، پھولوں، جانوروں، موسموں، رنگوں، پودوں، پہاڑوں، آبشاروں، جھیلوں، اور یادگار لمحات میں پایا جاتا ہے۔ کچھ یادیں بھی حسین ہوتی ہیں۔ ہر وہ چیز جس سے محبت محسوس ہو حسین ہے۔ حسن اور محبت لازم وملزوم ہیں۔ عاشق کو محبوب کا چہرہ حسین ترین لگتا ہے بلکہ محب کی محبت ہی محبوب کو حسین ترین بنا دیتی ہے۔ جو لوگ خوبصورتی سے متاثر نہیں ہوتے ان کے دل سخت چٹان ہیں جن پر کوئی بھی چیز اثر نہیں کرتی۔ جیسے بارش پتھر اور مٹی دونوں پر برستی ہے اسی طرح حسن بھی نرم اور سخت مزاج انسان پر اثر انداز ہوتا ہے لیکن نرم دل پگھل جاتے ہیں جبکہ سخت دل بارش کی طرح حسن سے کوئی اثر نہیں لیتے اور حسن ان کو متاثر کیے بغیر گزر جاتا ہے۔ شاعر چونکہ حساس طبیعت کے مالک ہوتے ہیں اس لیے وہ خوبصورتی سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ ان کا محبت میں مبتلا ہونا فطری سی بات ہے۔ یہ محبت کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ سیّد انصر بھی خوبصورتی سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ کریں:

ہر غنچے میں تیری صورت ہر گل میں تیری خوشبو
ہر لہجے میں تیرا لہجہ ہر منظر میں تو ہی تو ہے(11)

ان کی شاعری میں بھی حسن اور محبت دونوں موجود ہیں بلکہ یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہو گا کہ شاعری کا آغاز ہی حسن سے متاثر ہونے پر ہوتا ہے۔ شاعر اپنے محبوب کے لیے پیدا ہونے والے جذبات کو شاعری کے ذریعے بیان کرتا ہے۔ ان کی شاعری میں بھی حسن اور محبت کا ذخیرہ ہے۔ وہ اپنے محبوب کی آنکھوں کی خوبصورتی سے بہت متاثر نظر آرہے ہیں۔ وہ ان آنکھوں کے جمال میں کھو کر زمانے سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ شعر ملاحظہ ہو:

ہم زمانے سے بے خبر ٹھہرے
کر کے دیدار تیری آنکھوں کا (12)

واصف علی واصؔف کا کہنا ہے کہ خوبصورتی دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتی ہے جبکہ سیّد انصر کا کہنا ہے کہ خوبصورتی انسان کے دل میں ہوتی ہے۔ آنکھیں تو ایک جیسی ہوتی ہیں۔ دیکھنے والے کے دل میں خوبصورت جذبات ہوتے ہیں جو آنکھ کے زریعے اس چیز کو خوبصورت بنا دیتے ہیں۔ کوئی ایک چیز کسی شخص

کے لیے بہت عام اور معمولی سی ہوتی ہے لیکن وہی چیز کسی دوسرے شخص کے لئے بہت خاص ہو سکتی ہے۔ اس طرح یہ دل ہی ہے جو کسی بھی چیز یا شخص کو حسین بناتا ہے۔

غم:

معاشرے میں بڑھتی ہوئی بد امنی، ظلم و ستم کا گرم بازار، افراتفری، لڑائی جھگڑے اور لوٹ مار کے مناظر انسان کو غمگین کر دیتے ہیں۔ ایک غم انسان کا اپنی ذات تک محدود ہوتا ہے اور دوسرا اجتماعی نوعیت کا۔ غم جاناں سے غم دوراں تک کا سفر شاعری کو وسعت عطا کرتا ہے۔ جب دوسروں کا غم اپنا غم محسوس ہونے لگے تو شاعری کے نئے دروازے کھلتے ہیں۔ یہ اعلیٰ ظرفی اور انسانیت کی معراج ہے۔ سیّد انصر اپنی شاعری میں غم کو یوں بیان کرتے ہیں:

پریشاں لوگ ، ویراں شہر، حیراں چاند، سہمی رات
پڑا ہو کاکل ہستی میں جیسے خم اداسی کا(13)

شاعری کا تعلق چونکہ جذبات سے ہے اور شاعری جذبات کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہے۔ جو بات انسان عام الفاظ میں بیان کرتے ہوئے ہچکچاتا ہے وہ اشعار کے ذریعے آسانی سے کہہ سکتا ہے۔ یہی جذباتیت شاعری کو آفاقیت عطا کرتی ہے اور دل سے نکلی ہوئی بات سیدھا دل پر ہی اثر کرتی ہے۔ جس معاشرے میں نا انصافی اور ظلم و ستم کا بازار گرم ہو وہ معاشرہ بگاڑ کا شکار ہو جاتا ہے۔ ہمارے معاشرے کا بھی یہی المیہ ہے کہ یہاں زیادہ تر لوگ اپنی ذات اپنے مفاد کے بارے میں سوچتے ہیں۔ انہیں اپنا مطلب اور اپنا فائدہ عزیز ہوتا ہے۔ جبکہ انسانیت یہی ہے کہ دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہوا جائے اور دوسرے کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھا جائے۔ انسان پر ماحول کا اثر ہونا یقینی امر ہے۔ ایک درد مند دل رکھنے والا انسان چاہتا ہے کہ ہر جا امن و امان ہو۔ لوگوں کی پریشانیاں ختم ہو جائیں۔ ایک شاعر بھی دنیا کے رنج والم دیکھ کر غمگین ہو جاتا ہے اور اپنے اشعار کے ذریعے اس کا اظہار کرتا ہے۔ دلی کیفیات اور الفاظ کو شعری قالب میں ڈھالنے کا نام شاعری ہے۔ کسی بھی شاعر کی زندگی اور اس کی شاعری پر ارد گرد کے حالات کسی نہ کسی طرح ضرور اثر انداز ہوتے ہیں۔ سیّد انصر بھی ارد گرد کے حالات سے متاثر ہوتے ہوئے لکھتے ہیں:

سارے چہرے بجھے سے ہیں
کیا کوئی سانحہ ہوا ہے آج(14)

یہاں سرمایہ دار طبقہ آزاد اور عیاش ہے جبکہ غریب انسان ہر طرف سے مشکلات سے دوچار ہے۔ یہ دکھی حالات عام لوگوں کی نسبت شاعروں کو زیادہ دکھ دیتے ہیں۔ انسان حالات کو دیکھ کر پہلے پہل ان حالات سے خود متاثر ہوتا ہے اور پھر یہ دکھ پورے معاشرے کا دکھ محسوس ہونے لگتا ہے۔ آرزوؤں کا نامکمل رہنا بھی پریشانی کا باعث ہوتا ہے۔ کچھ غم ایسے ہوتے ہیں جن کا کوئی مداوا نہیں کر سکتا۔ وہ غم لادوا بن جاتے ہیں۔ اور انسان کو اندر ہی اندر کھا جاتے ہیں۔ یہ غم کسی اپنے کے بچھڑنے کا بھی ہو سکتا ہے، کوئی بہت عزیز چیز چھن جانے کا بھی، یا پھر کسی اپنے کو تکلیف میں دیکھ کر بھی انسان غمگین ہو جاتا ہے۔ اچھا انسان وہی ہے جو دوسروں کا دکھ درد محسوس کرے۔ جب ذات کا غم آفاقیت اختیار کر لیتا ہے تو انسان کے دل میں اپنی ذات سے ہٹ کر دوسروں کے لئے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی سچا اور آفاقی جذبہ ہے۔ غم کی آفاقیت کے بارے میں فراق گورکھپوری یوں رقمطراز ہیں:

"غم عموماً شروع تو ہوتا ہے کسی سانحے سے لیکن اگر صحیح معنوں میں کسی کو توفیق غم ہوئی تو یہی غم حیات و کائنات کی معنویت کو سمجھنے کا ذریعہ بن جاتا ہے اور اس میں آفاقیت آجاتی ہے۔"(15)

اپنا مطلب نکالنے کے لئے طاقتور لوگ غریبوں اور مجبوروں کو جھوٹے سہارے اور حوصلہ دیتے ہیں مگر جونہی مطلب نکل جاتا ہے تو ان کو پہچاننے سے بھی انکار کر دیتے ہیں۔ آئے روز خبروں کے لاتعداد چینلز پر بھی یہی کچھ دیکھنے کو ملتا ہے اور اخبارات بھی ایسے تبصروں سے بھرے ہوتے ہیں۔ مگر ان کا حل کوئی نہیں نکلتا۔ جس مقام سے دوسرے لوگ آنکھیں بند کر کے گزر جاتے ہیں شاعر اس مقام پر خاموش نہیں رہ سکتا۔ وہ شاعری کے ذریعے اس اجتماعی دکھ کو بیان کرتے رہنا اپنا فرض سمجھتا ہے اگر ایسا نہ کرے تو اس کا ضمیر اس کو ملامت کرتا رہتا ہے۔ شاعر اپنی بات منطق یا دلیل کے ذریعے نہیں کرتا بلکہ وہ جذباتیت کا سہارا لیتا ہے۔ یہ جذباتیت شاعری کو اثر پذیری عطا کرتی ہے۔ جس سے اشعار سیدھا ذہن کی بجائے دل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یوسف حسین خان اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"تخیل اپنی توجیہ خود اپنے انداز میں کرتا ہے اس کے علاوہ کوئی انداز پسند نہیں کرتا۔ وہ ان باتوں کو جو عقلی طور پر پہلے سے ثابت ہیں۔ اپنے طور پر اپنے رنگ میں بالکل دوسری طرح ثابت کرتا ہے۔ اس کا استدلال منطقی استدلال سے جدا ہوتا ہے۔ وہ جذباتی طور پر فکر کرتا ہے نہ کہ منطقی طور پر۔"(16)

سیّد انصر کے نزدیک غم صرف ذاتی ہی نہیں ہوتا بلکہ کسی دوسرے شخص کے دکھ درد کو انسانیت کے ناطے اپنا دکھ سمجھنا، اس کی تکلیف کو اپنی تکلیف محسوس کرنا اور اس کو لفظوں کے موتی پہنا کر اس درد کا مداوا کرنا ہی حقیقی غم ہے۔ وہ تمام انسانوں کے غم کو اپنا غم سمجھتے ہیں۔ ان کے غم میں آفاقیت پائی جاتی ہے۔ غموں سے گزرنے کے باوجود بھی انسانی دل سے امنگ اور امید ختم نہیں ہوتی۔ انسانی دل غموں کو برداشت کرنے کی خاصی طاقت رکھتا ہے۔ غموں کو سہنے کے باوجود یہ دل نرم اور نازک ہی رہتا ہے۔ سیّد انصر اس بارے میں رقمطراز ہیں:

غم حد سے جو گزرا ہے تو احساس ہوا ہے
دل بجھ کے بھی دل رہتا ہے پتھر نہیں ہوتا(17)

احساس آدمیت جس معاشرے سے ختم ہو جائے وہاں بہت سے بگاڑ جنم لے لیتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں اکثر غموں اور دکھوں کی وجہ ناانصافی اور ظلم و ستم ہے۔ اچھا انسان وہی ہے جو ان پریشانیوں سے نہ گھبرائے۔ غم اور دکھ تو انسان کے ساتھ لگے رہتے ہیں۔ انسان کو ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ کبھی ناامید اور مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اپنی منزل مقصود تک ضرور پہنچنا چاہیے خواہ راستے میں کتنی ہی رکاوٹیں کیوں نہ ہوں۔

اُمید:

امید حوصلہ، ہمت اور بھروسہ کا نام ہے۔ کسی سے توقع رکھنا امید ہے۔ کسی خواہش کے انجام پذیر ہونے کا خواب دیکھنا بھی امید ہے۔ امید مثبت تعمیری عمل ہے۔ جو اپنے اور دوسروں کے لیے سکون کا باعث بنتی ہے۔ امید کے سہارے انسان ہر غم، دکھ اور درد کو سہتا ہے۔ اس امید کے سہارے نوجوان میدان جنگ میں اترتے ہیں۔ فتح کی امید لیے دشمنوں سے مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں۔ امید سے ہی انسان کو زندگی میں خوشیاں ملتی ہیں۔ اسی امید کے سہارے انسان میں مشکلات سے نمٹنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ کسان اچھا پھل پانے کی امید میں اپنی فصل بوتا ہے۔ ایک طالب علم کامیابی کی امید لیے امتحان میں بیٹھتا ہے۔

امید اس خوشی بھرے احساس کا نام ہے جو انسان کو طاقت عطا کرتا ہے۔ نئے نئے حادثات، دکھ، تکلیف، مختلف مسائل اور تیزی سے بڑھتے ہوئے خوف و ہراس میں بھی اچھائی کی امید رکھنا رجائیت کہلاتا ہے۔ بقول ڈاکٹر سیّد عبداللہ:

"غم سے نباہ کا رویہ یہ بھی ہے۔۔۔ کہ غم کو حقیقت جاننے کے باوجود زندگی کے توازن اور وقار کو برقرار رکھا جائے۔ مسکراہٹ کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔

زندگی کو نفرت سے نہ دیکھا جائے اور غم کو ایک لازمی جزو قرار دے کر اس کو تکمیل زندگی کا ذریعہ بنایا جائے۔"(18)

جب تک دنیا باقی ہے تب تک امید باقی ہے۔ امید تلخ حالات کو شیریں حالات میں بدل دیتی ہے۔ اچھی امید رکھنا اور دوسروں کو بھی اچھی امید دلانا مثبت رجائی رویہ ہے۔ امید ایک خوبصورت احساس ہے۔ امید غموں سے لڑنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے اور چہرے پر مسکراہٹ بکھیرتی ہے۔ یہ اچھے مستقبل اور روشن راہوں کو ہموار کرتی ہے۔ ایسی سوچ کہ غم مستقل اور دائمی چیز نہیں بلکہ یہ ختم ہونے والی چیز ہے تو یہ رویہ رجائیت کی طرف لے جاتا ہے۔ سیّد انصر بھی دوسرے شاعروں کی طرح رجائی رویہ رکھتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس رویے کی ترغیب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

حالات سے مایوس نہ ہونا اسے کہنا
امید پہ قائم ہے یہ دنیا اسے کہنا(19)

جب تک سانس باقی ہے تب تک آس باقی ہے۔ اس لیے جب تک سانسوں کی ڈوری چلتی ہے انسان کی زندگی میں امید ہمیشہ قائم رہنی چاہیے۔ مایوسی کفر ہے۔ جہاں امید ختم ہوئی وہیں پر زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ زندگی میں جینے کی لگن اور حوصلہ وہیں ختم ہو جاتا ہے۔ دنیا میں ہر کام کسی نہ کسی امید کے زیر سایہ ہوتا ہے۔ حالات کیسے بھی ہوں ان سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ بلکہ یہ بات ہمیشہ ذہن میں رہے کہ اگر آج دن برے ہیں تو اچھے دن بھی انشاء اللہ ضرور آئیں گے۔ اسلام میں بھی مایوسی سے منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالی انسان کی ہمت سے زیادہ اس پر بوجھ نہیں ڈالتا۔ یہ تکلیفیں اور مصیبتیں بعض اوقات کسی غلطی یا گناہوں کی سزا ہوتی ہیں اور بعض اوقات یہ مشکلات انسان پر آزمائش کی صورت میں آتی ہیں۔ جسے صبر اور مسکراہٹ سے برداشت کرنا بہادری کا کام ہے۔ یہ بہادری اچھے دنوں کی امید میں ہی آ سکتی ہے۔

اپنوں کا بچھڑنا انسان کو غم میں مبتلا کر دیتا ہے۔ رجائیت پسند ایسے حالات میں بھی مایوس نہیں ہوتا۔ جدائی کے لمحات میں بھی اسے یہ امید زندہ رکھتی ہے کہ کسی نہ کسی دن اسے اپنا محبوب ضرور ملے گا۔ امید اس کے اندر ایک نئی جستجو اور لگن پیدا کرتی ہے۔ وہ صبر اور ہمت سے سے ملنے کا انتظار کرتا ہے۔ سید انصر بھی ایسے لوگوں میں شامل ہیں جو امید کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ امید کا سہارا لیے وہ جانے والوں کا انتظار کرتے ہیں کہ وہ جلد یا بدیر انشاء اللہ واپس لوٹ آئیں گے۔ کیونکہ انہیں یہ امید ہوتی ہے کہ ہر چیز اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے۔ سیّد انصر اس امید کو اپنی شاعری میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

آج بھی دل کو یہ امید سی ہے
لوٹ ہی آئے گا جانے والا(20)

دکھوں اور غموں کو ہنس کر برداشت کرنا اور مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا امید ہے۔ ہر اندھیرے کے بعد روشنی ہے۔ ہر مشکل کے بعد آسانی ہے۔ امید ایک ایسا طاقت بھرا احساس ہے جو کسی فنکار کو آگے بڑھنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اس میں مزید کام کرنے کی لگن پیدا کرتا ہے۔ اس طرح اس کے دل میں مزید اچھا کرنے کی لگن روز بروز بڑھتی ہے۔ انسان کو اس کا نام نہیں بلکہ اس کا کام زندہ رکھتا ہے۔ اس کا عمل دوسروں کے لیے تکلیف یا خوشی کا باعث ہوتا ہے۔ اس کا عمل ہی اسے دوسروں کی نظر میں اچھا یا برا بناتا ہے۔ انسان کے اعمال اس کا پرتو ہوتے ہیں۔ اپنے اعمال سے ہی انسان کی پہچان ہے۔ کیونکہ انسان تو مر کر اس دنیا سے چلا جائے گا۔ لیکن اس کے اعمال ہی دنیا میں اس کا نام زندہ رکھیں گے۔ سیّد انصر کو بھی اس بات کی امید ہے کہ ان کے اشعار اور ان کا کام انہیں دنیا میں زندہ رکھے گا۔ اس بارے میں لکھتے ہیں:

مجھ کو دعویٰ نہیں امید ہے ان شاء اللہ
زندہ رکھیں گے جہاں میں میرے اشعار مجھے(21)

امید انسان کی ہمت بندھاتی ہے۔ اسے مایوسی سے لڑنے کی طاقت عطا کرتی ہے۔ امید کی ڈور انسان کو گرنے نہیں دیتی۔ یہ روشنی تک لے جانے کے لئے اندھیری راہوں سے گزرنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ کٹھن راہوں سے گذرنے اور روشنی تک لے جانے کی ہمت عطا کرتی ہے۔ تکلیف دہ حالت سے گزرنا بہت ہمت اور صبر کا کام ہے۔ لیکن انسان میں یہ امید زندہ ہو تو وہ صبر اور بہادری سے ان تکلیفوں، دکھوں، پریشانیوں اور مصیبتوں سے مسکراتے ہوئے گزر جاتا ہے۔ چاہے اس کی آنکھیں ان مشکلات سے لڑتے لڑتے بند ہی کیوں نہ ہو جائیں وہ آخر دم تک مشکلات سے لڑے گا۔ اپنی زندگی میں آسانیوں کو لا کر ہی دم لے گا۔ یہ امید ہی ہے جو منزل کو پانے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ اس طرح منزل تک پہنچنے کا ولولہ باقی سب مصائب کو بھلا دیتا ہے۔ سیّد انصر میں بھی یہ ہمت، حوصلہ اور رجائیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ مشکلات سے نبرد آزما ہونے کے بارے میں لکھتے ہیں:

شب سے الجھوں گا اندھیروں کے فنا ہونے تک
آنکھ بجھتی ہی تو بجھ جائے ضیا ہونے تک(22)

امید انسانی زندگی میں روشنی کی ایک کرن ہے۔ جو دل کو مایوس نہیں ہونے دیتی اور اس کی سوچ کو مثبت رکھتی ہے۔ ہمیشہ اچھائی کی امید رکھنا رجائیت کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ امید انسان کو آخری دم تک لڑنے کا حوصلہ کرتی ہے۔ غموں کو سہتے ہوئے مسکرانا امید کی علامت ہے۔ یہ امید کی اعلیٰ ترین سطح ہوتی ہے۔ جس میں انسان اندھیروں سے نکل کر روشنی میں آجاتا ہے۔ یہ امید انسان میں اتنی طاقت اور ہمت عطا کرتی ہے کہ وہ آخری دم تک ان اندھیروں اور مشکلات سے لڑ سکتا ہے۔

درد / دُکھ:

درد ایک اندرونی کیفیت کا نام ہے۔ جو کسی امید کے ٹوٹنے کے سبب پیدا ہوتا ہے اور اس کا احساس انسان کو توڑ دیتا ہے۔ درد و تکلیف کا ایک سبب ماضی کی تلخ یادیں ہیں۔ محبت درد کی وجوہات میں سے ایک ہے۔ شاعری میں درد کے بہت سے محرکات سامنے آتے ہیں۔ کبھی عاشق کو عشق سے ملا درد اتنا عزیز ہوتا ہے کہ اس کو دل سے مٹانے کو جی نہیں چاہتا کیونکہ اس میں ایک سکون چھپا ہوتا ہے۔ محبوب کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات جو ماضی کو یاد کرنے کا سبب تو بنتے ہیں لیکن حال میں محبوب کے ساتھ نہ ہونے کا غم درد کی وجہ بنتا ہے۔ تنہائی میں ماضی کے جھروکوں میں الجھا ہوا انسان پرنم آنکھوں سے اس کی شدت کو محسوس کرتا ہے تو دل میں ایک کسک پیدا ہوتی ہے۔ ایک شعر ملاحظہ کریں:

مٹتا نہیں غم گُھٹ جائے نہ دم تاروں کی قسم
اے چاند ذرا کچھ دیر ٹھہر تنہا ہوں میں(23)

یہ حقیقت ہے کہ عشق ہی زندگی ہے۔ جب محبت ہوتی ہے تو جدائی کی وجہ سے درد ملتا ہے اور جب درد حد سے بڑھ جائے تو دوام ہو جاتا ہے۔ یوں زندگی حسین لگنے لگتی ہے اس کے برعکس ہجر و فراق میں ایسا درد نصیب ہوتا ہے جس کی دوا نہیں ہوتی۔ شاعری میں درد محبت سے آشنائی کو زندگی کی معراج قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ درد کی وجہ اگر محبت نہیں تو جینے میں قرار آتا ہے اور نہ مرنے میں راحت ملتی ہے۔ عاشق پر درد محبت کا مان رکھنا ضروری ہوتا ہے کیونکہ درد محبت میں نا تو گریہ وزاری ہوتی ہے اور نہ ہی شکوہ فریاد کے راگ الاپے جاتے ہیں۔ درد محبت میں انسان کی سانسیں بہت طمانیت کے ساتھ چلتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ململ کا کپڑا کانٹوں پر پڑا ہو اور تیز ہوا کا جھونکا اس کپڑے کو اڑانے کی کوشش کر رہا ہو مگر وہ کانٹے کپڑے میں پیوست ہو کر اس کا دامن تھامے ہوئے ہوں۔ کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے صحرا میں پانی اپنا آپ کھو دیتا

ہے ایسے انسان کی سلگتی ہوئی سانسیں درد میں رہتی ہیں اور بچھڑنے کا غم شدت اختیار کر لیتا ہے۔ سیّد انصر جدائی کے دکھ کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ کریں:

آنکھ روئی نہ ہنسے زخم بڑی مدت سے
دل کی دہلیز پہ ٹھہرا ہوا موسم کیا ہے(24)

عشق میں انسان جب درد سے آشنا ہو جائے تو ماضی کی یادیں درد میں اضافے کی وجہ بنتی ہیں۔ یہ ایک ایسا احساس ہے جو دل میں بھر جائے تو انسان کو خاک میں ملا دیتا ہے۔ دل میں پیدا ہونے والا درد عشق کا حاصل ہوتا ہے جو ایک عاشق کا سرمایہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے تمام عمر اس کی آبیاری آنسوؤں سے ہوتی ہے۔ شاعری میں درد اور دکھ کی داستان کو بیان کرنے کا ہر انداز اپنایا جاتا ہے۔ کبھی شکوہ ظلمت محبوب کیا جاتا ہے اور کبھی چپ سادھ لی جاتی ہے۔ کبھی اداسی اور دکھ کی وجہ یادوں کو کہہ دیا جاتا ہے اور کبھی تنہائی کو اس کی وجہ قرار دیا جاتا ہے۔ سید انصر نے اپنی پریشانی میں ہونے والے درد کو تنہائی کی وجہ قرار دیا ہے۔

ہجر و فراق:

ہجر و فراق کا موضوع شاعری کا پسندیدہ ترین موضوع ہے۔ ہجر کو اردو زبان میں محبوب سے دوری اور اس سے ملنے کی خواہش میں بکثرت استعمال کیا جاتا ہے۔ اردو زبان میں اس کے لئے فراق کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ جب کسی انسان کو محبوب سے بچھڑنے کا خوف ہوتا ہے تو وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر بار بار محبوب کو اپنی محبت کا یقین دلاتا ہے مگر بے سود۔ ہجر و فراق کے موسم میں بعض دفعہ انسان اتنی بے بسی محسوس کرتا ہے کہ وہ مجبور ہو کر محبوب سے التجا کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ بے بسی اور جنون کے عالم میں اس کی سرخ آنکھوں سے نکلنے والے آنسو اس کے دل کی حالت کو بیان کرتے ہیں۔ بے بسی اس قدر ہوتی ہے کہ محبوب کے ساتھ گزرا ہوا ہر لمحہ پورے جذبات کے ساتھ یاد آرہا ہوتا ہے اور وہ اس جنونی کیفیت میں اپنے محبوب کو پکارتا ہے۔ ان ویران لمحوں میں اسے ان حسرتوں پر شدید دکھ کا احساس ہوتا ہے۔ جو حسرتیں اس کے دل میں رہ جاتی ہیں وہ ان دنوں کو یاد کر کے اداس اور غمگین ہو جاتا ہے کہ جس میں اس نے اپنے محبوب کے ساتھ مل کر آئندہ آنے والے دنوں کے لیے خواب سجائے ہوتے ہیں۔ سیّد انصر کی شاعری میں بھی ہجر و فراق کا عالم ہے۔ اس پر وہ کچھ اس طرح رقمطراز ہیں:

ایک روز تمنا کے سرابوں سے نکل جائے
وہ مجھ سے بچھڑ جائے عذابوں سے نکل جائے(25)

اگر ہجر کا موسم ہر طرف پھیلتا ہے تو انسان کو کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ یوں لگتا ہے کہ یہ دنیا ویران ہو گئی ہے۔ جب دل کا موسم ہی اداس ہو تو باہر کی رنگینیاں بھی نہیں بھاتیں۔ ہر طرف ویرانی ہی ویرانی نظر آتی ہے۔ ہجر کی رات بہت طویل اور تاریک ہوتی ہے اور دل کی اداسی سے شامیں بھی اداس لگتی ہیں۔

محبوب کی رضا میں راضی رہنا محبت کا تقاضا ہے۔ اگر محبوب بچھڑنے پر آمادہ ہے تو اسے ہنسی خوشی قبول کرنا ہی محبت ہے۔ بچھڑنا تو قانون قدرت ہے۔ جس طرح ہر غم کے بعد خوشی ہے اسی طرح ہر ملن کے بعد جدائی ہے۔ وصل کے وہ یادگار لمحے جو ایک ساتھ گزرے ہوتے ہیں ان کے بعد بچھڑنے کا عمل لازمی ہے۔ جس طرح بہار کے بعض خزاں کا آنا لازمی ہے اسی طرح وصل کے بعد ہجر کا موسم آتا ہے۔ اردو شاعری میں زیادہ تر ہجر کو اہمیت دی گئی ہے۔ اس بارے میں رفیع الدین ہاشمی کہتے ہیں:

"غزل میں حسن و عشق کی مختلف کیفیات مثلاً درد و غم، سوز و گداز، ہجر وصال، محبوب کا ظلم و ستم، اس کی بے وفائی و ناز و ادا کا بیان ہوتا ہے۔ تاہم اسمیں اتنی وسعت، رنگارنگی اور تنوع ہے جتنی خود زندگی یا کائنات متنوع اور وسیع ہے"(26)

یہی وجہ ہے کہ رشید احمد صدیقی نے جدید اردو غزل کو اردو شاعری کی آبرو قرار دیا ہے۔ جدائی کا لفظ پیار کرنے والوں کے لیے موت ہے۔ لیکن کبھی حالات کا دھارا ہمیں ایسی جگہ لے جاتا ہے کہ وہ لوگ جن سے رابطہ کیے بغیر ہم رہ نہیں سکتے جب تک ان سے بات نہ ہو جائے دل کہیں چین نہیں پاتا ان کے بغیر زندہ رہنا پڑتا ہے۔ جب محبوب کو دیکھنا اس سے ہر دکھ سکھ بیان کرنا ہی زندگی کا مقصد ہو ایسے میں دو پیار کرنے والے بچھڑ جائیں تو وقت کاٹے نہیں کٹتا۔ جب راستے کھو جائیں منزل بدل جائیں اور جدائی مقدر ٹھہرے تو انسان کا جینا محال ہو جاتا ہے۔ من چاہے شخص کا ساتھ زندگی کو حسین بنا دیتا ہے۔ پھر وہ زندگی کی راہ میں آنے والے مصائب کو ہنس کر جھیل لیتا ہے۔ جب محبوب سے دوری ستائے تو اس دنیا کی رونقیں بھی کچھ دل کو نہیں بھاتیں۔ محفل میں بھی انسان خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ سیّد انصر بھی تنہائی میں اپنے محبوب کو یاد کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

کتنی آسانی سے تم بزمِ جہاں چھوڑ چلے
اور یہ سوچا بھی نہیں کس کو کہاں چھوڑ چلے(27)

کسی کی یاد ایسا سمندر ہے جو کبھی خاموشی سے بہتا ہے اور کبھی اس میں تلاطم برپا ہو جاتا ہے۔ وقت گزر جاتا ہے اور پیچھے یادوں کا ذخیرہ چھوڑ جاتا ہے۔ ہجر و فراق کے موسم میں بعض دفعہ انسان اتنی بے بسی محسوس کرتا ہے کہ گزرے ہوئے وقت کا ایک ایک لمحہ بھاری معلوم ہوتا ہے۔ محبوب سے بچھڑنے کے بعد بھی محب اسے بھلا نہیں پاتا۔ اس کی یادیں ہر پل اس کے ساتھ رہتی ہیں۔ وہ محبوب سے بچھڑنے کی تکلیف کو ہر پل اپنے سینے میں محسوس کرتا ہے اور محبوب کے ساتھ گزرے ہوئے لمحوں کو یاد کر کے ہر وقت محبوب کے ہجر میں آنسو بہاتا ہے۔ یہ جدائی کے لمحات اس کی زندگی میں تلخیاں بھر دیتے ہیں۔

یادیں:

یادوں کو شاعری کا اہم ترین موضوع تصور کیا جاتا ہے۔ انسانی زندگی کے نشیب و فراز، تلخ و شیریں حقائق جنہیں وہ چاہتے ہوئے بھی نہ بھلا سکے یاد کا روپ دھار لیتے ہیں۔ یادیں ایسا سہارا ہیں کہ محفل میں تنہائی کا سماں پیدا ہو جاتا ہے۔ یادوں کا تعلق انسان کے ماضی سے ہوتا ہے۔ کچھ یادیں انتہائی خوشگوار اور کچھ بہت تلخ ہوتی ہیں۔ خوشگوار یادیں انسان کے لیے مسرت کا باعث بنتی ہیں جبکہ ناخوشگوار یادیں انسان کو پریشان کر دیتی ہیں۔ یادوں کا تنہائی سے بہت گہرا واسطہ ہے۔ فرصت کے لمحات میں جب اکیلے بیٹھ کر انسان اپنے ماضی پر نظر دوڑاتا ہے تو زندگی کے بہت سے واقعات یادوں کی صورت میں سامنے آ جاتے ہیں۔ یادیں مناظر بھی تخلیق کرتی ہیں، انسان کو خوشی بھی دیتی ہیں اور اکثر اوقات رلا بھی دیتی ہیں۔ نشیب و فراز زندگی کا حصہ ہے۔ شاعر اپنے ماحول کی ترجمانی کرتا ہے۔ اردو شاعری میں اب موضوعات کا تنوع دیکھنے کو ملتا ہے۔ زبیر رضوی لکھتے ہیں:

> "پہلے دور میں ہر بات محدود اور معین تھی۔ اصناف سخن محدود تھی۔ موضوع شاعری کا ایک معین دائرہ تھا اور اس کے ساتھ ہی ہر شخص کا ذہنی افق بھی ایک ہی رنگ کا حامل تھا۔ نئے دور میں موضوعات میں وسعت پیدا ہوئی۔ اصناف سخن میں بھی نت نئے بت ڈھالے جانے لگے۔ اور ذہنی افق بھی اپنے رنگا رنگ جلووں سے نگاہوں کو لبھانے لگا۔"(28)

یادیں زندگی کا سرمایہ ہوتی ہیں۔ یہ جس قدر پرانی ہوتی ہیں ان کی قدر و قیمت اس قدر ہی بڑھ جاتی ہے۔ آخر کار یہ یادیں شاعر کا سرمایہ حیات بن جاتی ہیں۔ یادوں سے جان نہیں چھڑائی جاسکتی۔ ابتدا میں یادیں بڑی اچھی لگتی ہیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بوجھ بننے لگتی ہیں۔ انسان ناچاہتے ہوئے بھی یہ بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے رکھنے پر مجبور ہوتا ہے۔ انسان یادِ ماضی سے جان چھڑانا چاہتا ہے لیکن چھوٹتی نہیں۔ سیّد انصر بھی یادِ ماضی میں کھوئے ہوئے لکھتے ہیں:

آنکھ روشن ہے ابھی نقشِ قدم زندہ ہے
جانے والے تری یادیں تیرا غم زندہ ہے(29)

جب یادیں روشنی کی صورت اختیار کرلیتی ہیں تو رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتی ہیں اور منزل کا راستہ روشن ہو جاتا ہے۔ زندگی خوبصورت ہو جاتی ہے۔ جب تنہائی میسر آئے تو انسان یادوں کی جنت میں آرام بھی کرلیتا ہے۔ بعض اوقات کسی کی یاد دل میں اس قدر بسیرا کرلیتی ہے کہ انسان یادوں کے سہارے ملاقات کا سرور بھی حاصل کرلیتا ہے۔ وہ محبوب کی سوچ میں گم اردگرد کے ماحول سے بے خبر اپنی ہی دنیا میں مگن ہوتا ہے۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان یادوں کی بھیڑ میں اس قدر الجھن کا شکار ہو جاتا ہے کہ اسے سمجھ نہیں آتا کیا کیا جائے۔ جب ماضی کی تلخ یادیں ستاتی ہیں تو دل کہیں چین نہیں پاتا۔ ایسی حالت میں انسان اداس اور پریشان ہو جاتا ہے اور جب خوشگوار یادیں آتی ہیں تو دل کے اندر بہار آجاتی ہے۔ انسان دکھوں کو بھول کر مسرت محسوس کرتا ہے۔ سیّد انصر ان یادوں کا دکھ محسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

سینے میں ثبت کر گیا مُہریں جُدائی کی
رستے میں نصب کر گیا یادوں کی سُولیاں(30)

وصل کے لمحات میں گزارے گئے دن ہی محبت کی یادگار ہوتے ہیں۔ اگر کوئی ان وعدوں اور یادوں کو بھول جائے تو محبوب سے شکوہ تو بنتا ہے۔ یاد بظاہر ایک چھوٹا سا لفظ لگتا ہے مگر اس نے اپنے اندر ایک دنیا آباد کر رکھی ہے۔ خوشی کی دنیا، غم کی دنیا، مسکراہٹ کی دنیا، قہقہوں کی دنیا اور آہ وزاریوں کی دنیا۔ ہم گزرے لمحوں کو یاد کرتے ہیں تو کبھی غمگین ہو جاتے ہیں اور کبھی خوش۔ یادیں سرمایہ بھی ہوتی ہیں اور کمزوری بھی۔ یہ ہمیں مضبوط بھی کرتی ہیں اور ہمارے اندر توڑ پھوڑ بھی جاری رکھتی ہیں۔ غرض یادوں کا طوفان تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ ہماری زندگی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ جو دل کو بھا جائے وہ دل

کی گہرائیوں تک اتر جاتا ہے۔ پھر حالت یہ ہوتی ہے کہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، کوئی کام کرتے ہوئے بھی انسان اسی شخص کے خیالوں میں کھویا رہتا ہے۔ ہر چیز میں جمال رخ یار کا عکس نظر آتا ہے۔ تخیل کے بارے میں شیکسپیئر نے کہا ہے:

" دیوانے، عاشق اور شاعر میں تخیل کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ورڈزورتھ نے کہا کہ تخیل، قدرت مطلق، واضح ترین بصیرت، وسعت قلب اور عقل کی بالیدہ ترین کیفیت کا نام ہے۔"(31)

یادیں چیزوں سے وابستہ ہوں یا لوگوں سے، کسی پیارے کی جدائی کا دکھ ہو یا کسی کے ساتھ گزرے حسیں لمحے، ہمارے دل کی دنیا میں ایک طوفان آتا ہے اور آکر گزر جاتا ہے۔ اس طرح یادیں بنتی رہتی ہیں۔ یادوں کا سلسلہ ہمارے ہوش میں آنے سے شروع ہوتا ہے تو سانس کے ختم ہونے پر ہی اختتام پذیر ہوتا ہے۔ انسان سب کچھ بھلا کر بھی پہلی محبت کو ہمیشہ یاد رکھتا ہے۔ سیّد انصر اس بارے میں کچھ یوں رقمطراز ہیں:

تمام عمر کا ملنا کوئی بھلا بھی دے
مگر وہ پہلی ملاقات ساتھ چلتی ہے(32)

چاہتے نہ چاہتے ہوئے بھی کچھ واقعات ہمارے ذہن میں آجاتے ہیں اور ہم یادوں کی وادی میں اتر کر پھر ان کو یاد کرنے لگتے ہیں۔ اپنے ان خیالات اور الفاظ کو ایک بہترین لڑی میں پرونا اور ان الفاظ کو ایک انداز میں پیش کرنا شاعری ہے۔ شاعری کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے اور نہ ہی یہ ہر کسی کے بس کی بات ہے۔ دراصل شاعری، درد، خوشی، آنسو، خواہشات، محبت کے اظہار کا بہترین وسیلہ ہے۔ دل و دماغ میں چلنے والے احساسات کو لفظوں کی نظر کرنا شاعری ہے۔ اکثر انسانی سوچ ماحول کی عکاسی کرتی ہے۔ یہ یادیں شاعری کا سبب بنتی ہیں۔

زندگی کی حقیقت:

اس کائنات کی حقیقت زندگی پر مبنی ہے اور خدائے بزرگ و برتر نے کائنات میں موجود اشیا کو زندگی کی نعمت عطا کی۔ کائنات کی بنیاد جاندار اور بے جان اشیا پر مشتمل ہے۔ بے جان اشیا زندگی سے قاصر ہوتی ہیں جبکہ جاندار اشیا زندگی کی اکائی ہوتی ہیں۔ سائنس کی رو سے ہر جاندار کو زندگی کا سفر طے کرنا ضروری ہے۔

خدا کی طرف سے عطا کی گئی زندگی کے کئی مقاصد ہوتے ہیں۔ شعور اور عقل کے مطابق انسان اور باقی تمام ذی روح اشیا کا وجود زندگی ہے جبکہ سائنس کے مطابق سانسوں کا چلنا، آکسیجن کا جسم میں داخل ہونا اور

کاربن ڈائی آکسائیڈ کا اخراج، خون کی گردش انسانی زندگی ہے۔ زندگی کا تصور اور زندگی کے مقصد میں ایک نمایاں فرق ہے۔ تصور زندگی انسان کی پیدائش سے لے کر موت تک کا سفر ہے جبکہ مقصد زندگی یہ ہے کہ انسان کا اس دنیا میں آنے کا کیا مقصد ہے؟ جس میں جینے کا سلیقہ، نیکی اور بدی میں فرق، حسن اخلاق اور عبادات وغیرہ شامل ہیں۔ پیدائش سے موت تک کے سفر میں شعور کی منازل کو طے کرنا، نیکی اور شر میں تضاد کا تعین اور عبادات کے مختلف اختیار کردہ طریقے یہ سب انسانی زندگی کے مقاصد ہیں۔ زندگی تبدیلی کا نام ہے جو چیز آج ہے وہ کل ہمارے پاس نہیں ہوگی۔ اسی طرح غموں اور خوشیوں کا بھی یہی چکر ہے۔ سیّد انصر زندگی کے بارے میں یوں بیان کرتے ہیں:

کیا کہوں زندگی کے بارے میں
کل جزا تھی مگر سزا ہے آج(33)

سید انصر نے زندگی کے مقاصد کی وضاحت کرنے کے لئے شاعری کو ذریعہ بنایا ہے۔ خدائے بزرگ وبرتر نے زندگی گزارنے کے جو اصول انسان کو دیے ہیں وہی اس کا اصل مقصد ہیں۔ جن پر عمل کر کے انسان خدا کی رضا حاصل کر سکتا ہے اور ان مقاصد کی رسائی تک مکمل اختیار انسان کو دیا گیا ہے۔ زندگی ایک سفر پر مشتمل ہے اور منزل کی آشنائی خدا کی خوشنودی ہے۔ انسان کی زندگی بہت قیمتی ہے۔ اگر اس کو خدا کے احکامات کا پیروکار بنایا جائے تو زندہ رہنے کا مقصد پورا ہو جائے۔ زندگی کی حقیقت سے نا آشنائی بظاہر تو عیش و عشرت پر مبنی ہوتی ہے لیکن اس کے نتائج خاطر خواہ نہیں نکلتے کیونکہ زندگی پھولوں کی مالا نہیں بلکہ کانٹوں کی سیج ہے جس پر سے گزر کر انسان اطمینان سے زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ سیّد انصر زندگی کے بارے میں اپنے خیالات کی ایک وسعت رکھتے ہیں کیونکہ ان کی شاعری میں زندگی کے مقاصد کی آگاہی کا عنصر نمایاں ہے۔ ان کی شاعری کا فکری عنصر زندگی کی اہمیت اور اس کے مقاصد پر مبنی نظر آتا ہے چونکہ زندگی تجربات کی عکاسی کرتی ہے۔ اس کے مختلف پہلو ہیں۔ ان پہلوؤں کو شاعری کے ذریعے بیان کرنا ایک شاعر کی خوبی ہے اور سیّد انصر کی شاعری میں یہ خوبی نمایاں ہے۔ اپنے جذبات، احساسات اور محسوسات کو بیان کرنے کا نام زندگی ہے۔ ایک شعر ملاحظہ کریں:

تم نے یہ سلسلہ کبھی دیکھا ہے غور سے
ہر چیز ہے بندھی ہوئی لمحوں کی ڈور سے(34)

دنیا کی حقیقت زندگی کے فلسفہ میں پوشیدہ ہے۔ کہیں اس میں خوشیوں کی بہار کے رنگ نمایاں ہوتے ہیں اور کہیں خزاں کی اداسیاں اپنے تجربات کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ کبھی کبھی زندگی چار سانسیں ادھار دے کر انسان کی آنکھوں میں روشنی بھر دیتی ہے۔ انسان کی حیات کبھی گلاب کے پھول کی مانند ہوتی ہے خوبصورت رنگ بکھیرتی ہوئی اور کبھی خوشبو کی طرح ہوا میں بکھر جاتی ہے۔ سید انصر اپنی داستانِ حیات کو بھی پھول اور خوشبو سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ میری زندگی ایک ایسا سفر ہے کہ گلاب سے ہوتا ہوا ہواؤں میں بکھر جاتا ہے اور یہ ماہ و سال کا سفر رواں دواں ہے۔ شعر ملاحظہ فرمائیں:

رواں ہے قافلہ عُمر سال و ماہ کے ساتھ
کہ جیسے موجہ صرصر غُبارِ راہ کے ساتھ(35)

انسان کی ابتدا ایک خوشی کے لمحے سے ہوتی ہے۔ پیدائش سے بچپن کا سفر لاشعوری میں گزرتا ہے اور بچپن کھیل کود کی منازل سے گزرتا ہوا شعور کی ابتدا تک پہنچتا ہے۔ پھر جوانی کی سوچ سہرا باندھ لیتی ہے۔ معاش کی تلاش کے ساتھ ساتھ انسان ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دب جاتا ہے۔ اور یہ سفر آہستہ آہستہ اپنے اختتام کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ یہ وقت کا گزرنا ویسے تو بہت دھیما انداز اپناتا ہے لیکن اس کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے۔ سیّد انصر اس بارے میں کہتے ہیں کہ وقت کی چال بھی ایک جادو کی طرح لگتی ہے کہ آنکھ جھپکتے ہی کتنا سفر طے کر لیتی ہے۔ زندگی کے کئی سال بیت جاتے ہیں۔ شعر ملاحظہ کریں:

بیت جاتے ہیں دبے پاؤں مہ و سال حیات
وقت کی چال بھی اِک ساحری سی لگتی ہے(36)

زندگی وقت کے ساتھ اپنے رنگ بدلتی ہے۔ کبھی خوشیوں کے رنگ اس طرح ہر طرف پھیل جاتے ہیں کہ ہر شے قابل دید اور سکون دہ لگنے لگتی ہے اور جینے کا مزہ آتا ہے۔ کبھی اس میں سے رنگوں کی چاشنی ختم ہوتی ہوئی نظر آتی ہے اور آہستہ آہستہ ہر شے سے رنگ اڑ جاتے ہیں تو سب کچھ پھیکا پھیکا لگنے لگتا ہے۔ یوں زندگی مختلف مراحل پر جزا سے سزا کا سفر طے کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

بے وفائی:

بے وفائی کا مطلب دھوکہ دہی ہے۔ وفا کے نام پر دھوکا دینا بے وفائی کہلاتا ہے۔ اسلام بھی اس بات کی مذمت کرتا ہے کہ جس کسی نے مسلمان کو دھوکہ دیا اور اسے نقصان پہنچایا تو وہ مسلمان نہیں۔ دنیا منافقت

سے بھری پڑی ہے۔ ایسے لوگ جو اپنے مفاد کے لئے دوسروں کو دوست بناتے ہیں اور پھر اپنا مفاد پورا ہونے پر دوست کو دھوکا دے کر چھوڑ جاتے ہیں۔ محبت میں محبوب کی بے وفائی عاشق کے لئے بہت درد اور تکلیف کا باعث ہوتی ہے۔ اس بے وفائی میں ملا درد عاشق کو بے چینی عطا کرتا ہے۔ اس بے چینی میں وہ کبھی خود کو کوستا ہے کہ ایسے شخص پر اعتبار ہی کیوں کیا جو بے وفا تھا اور کبھی اس بے وفا محبوب کو موردِ الزام ٹھہراتا ہے۔ وہ محبوب سے زیادہ خود کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے کہ اس نے ایسے شخص سے دوستی ہی کیوں رکھی جو اعتبار کے قابل نہیں تھا۔ جس شخص نے اسے دھوکا دینا تھا وہ اس دھوکے باز کو پہچان کیوں نہیں سکا۔

معصوم لوگ اپنی معصومیت کی بنا پر جلد دوسروں پر اعتبار کر لیتے ہیں اور دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ انہیں ہر انسان اپنی طرح دل کا صاف اور کھرا لگتا ہے اس لیے وہ دھوکے بازوں کو پہچان نہیں سکتے۔ اپنوں کی بے وفائی انسان کو اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹ جاتی ہے۔ انسان مروت کے مارے اپنوں کی بے وفائی کسی دوسرے کو بتا بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ وہ خود کا اپنوں ہی کے ہاتھوں بے وقوف بن جانا کسی کے سامنے بیان نہیں کر سکتا۔ پھر انسان خود کلامی ہی کر سکتا ہے کہ ایسے انسان سے دوستی ہی کیوں کی جو بعد میں نقصان پہنچانے کا سبب بنا۔ اب پچھتانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ جہاں محبت ہو وہاں پر بے وفائی برداشت نہیں ہوتی۔ اس طرح وہ محبوب کی بے وفائی پر ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگتا ہے۔ ان حالات میں بے بس انسان خود پر جبر کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا۔ سیّد انصر بھی اس دھوکے باز سے تنگ آ کر لکھتے ہیں:

بدن سلگنے لگا ہے تو ہاتھ ملتے ہو
کہا تھا کس نے شراروں سے یاریاں رکھو(37)

بعض اوقات عاشق محبوب کی محبت میں خود کو جھوٹے دلاسے اور تسلیاں دیتا ہے کہ اس نے محبوب کی بے وفائی اور دھوکہ دہی کے متعلق جو سنا یا دیکھا وہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ وہ اس کا فریب نظر بھی ہو سکتا ہے۔ اس کا محبوب اس کے ساتھ دھوکا نہیں کر سکتا۔ وہ اس امید پر محبوب سے محبت کی التجا کرتا ہے کہ اس کے محبوب کی بے وفائی ثابت نہ ہو۔ بے وفا سے وفا کی امید رکھنا ایسا ہی ہے جیسا کسی کانٹے دار درخت سے پھل اگنے کی امید ہونا۔ جس طرح ببول پر پھل نہیں لگ سکتا اسی طرح بے وفا سے وفا کی امید نہیں کی جا سکتی۔ اس بے وفا سے تکلیف اور درد کے علاوہ کچھ نہیں مل سکتا۔ جو درد اور چبھن کانٹا دیتا ہے وہی درد اور تکلیف بے وفا دوست دیتا ہے۔ اس سے سکون کی امید رکھنا بیکار ہے۔ بے وفا محبت میں کیے سب وعدے بھول کر ہی بے

وفائی پر آمادہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس کو کچھ بھی سمجھانا اور یاد دلانا سب بیکار ہے۔ اس سے وفا کی امید رکھنا خود اذیتی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ سیّد انصر نے اسے اپنی شاعری میں اس طرح بیان کیا ہے:

بے وفاؤں سے وفا مانگنے نکلے ہیں دوست
کوئی پوچھے تو ببولوں سے ثمر کاٹو گے(38)

عاشق جو اپنے محبوب کے لئے مشکل راہوں پر نکلتا ہے۔ محبوب کے لیے ہر کسی سے لڑنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے محبوب کے لیے میدان جنگ میں بھی اترنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ ایسا عاشق یا دوست اپنے محبوب کے لئے بے غرض اور بے لوث محبت رکھتا ہے اور امید کرتا ہے کہ اس کو بدلے میں بھی ایسی ہی بے غرض محبت ملے۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے۔ محبوب زیادہ تر بے وفا نکلتا ہے۔ عاشق محبت کے نشے میں آنکھیں بند کر کے ایسے محبوب یا دوست پر اعتبار کر لیتا ہے جو صرف اور صرف اسے اپنی غرض کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اور اپنی غرض پوری ہونے پر اپنی پیدا کی ہوئی مصیبت دوست کے سر ڈال کر خود اس سے بچ نکلتے ہیں۔ دھوکہ دینے والے یہ بات بھول جاتے ہیں کہ دھوکہ ایسی چیز ہے جو کبھی نہ کبھی لوٹ کر واپس ضرور آتا ہے۔ اس لیے محبت میں بے وفائی گناہ تصور کی جاتی ہے۔ سیّد انصر بھی ایسے دوستوں کی بے وفائی پر شکوہ کناں ہیں:

میں تو جنگاہ میں اترا تھا انہی کی خاطر
دوست جو مجھ کو سرِ نوکِ سناں چھوڑ چلے(39)

ایسے دوست جنہوں نے کوئی لڑائی جھگڑے کی محفل گرم کر رکھی ہو۔ ایسے دوست کی مدد کے لئے دوسرے دوست کا جنگ کے میدان میں اترنا وفا کی علامت ہے۔ لیکن اس کا بے وفا دوست اسے جنگ کے میدان میں تنہا مرنے کے لئے چھوڑ کر خود میدان جنگ سے فرار ہو گیا۔ جن دوستوں کی خاطر اس نے خود کو مشکل میں ڈالا وہی دوست مصیبت میں اسے تنہا چھوڑ چلے۔ وہ خود غرض دوست منافقانہ رویہ رکھتے ہیں جو دوست کو اپنی جھوٹی وفاؤں کا یقین دلاتے ہیں۔

موت / فنا:

بقا کا متضاد فنا ہے۔ زندگی کے بعد مرنے کا نام موت ہے۔ ہر ذی روح انسان نے زندگی گزارنے کے بعد یہاں سے رخصت ہو جانا ہے۔ جسے مرنا، جدا ہونا اور موت کا نام دیا جاتا ہے۔ موت کا ایک وقت مقرر

ہے۔ یہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔ ہر چیز کو فنا ہے۔ ہر چیز عارضی ہے۔ مرنے کے بعد جو زندگی عطا کی جائے گی وہی مستقل اور حقیقی زندگی ہے۔ ہر چیز کو زوال ہے۔ موت پر ایمان رکھنا لازم ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد باری تعالٰی ہے:

"ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور قیامت کے دن تمہیں پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔" (40)

انسان اس دنیا کی محبت اور رنگینیوں میں کھو جاتا ہے۔ دنیا کی محبت میں عورت، بچے، ملک اور مال وزر وغیرہ شامل ہے۔ اس محبت میں مست ہو کر انسان موت کو بھول جاتا ہے۔ لیکن موت اچانک سے حملہ آور ہو کر انسان کو بے بس اور لاچار کر دیتی ہے۔ موت اس طرح انسان کی روح لے جاتی ہے جس طرح ہوا کی لہر شمع کی لو کو بجھا دے۔ اس طرح اچانک خاموشی سے انسان کو اس دنیا سے رخصت کر دیتی ہے۔ سیّد انصر کی شاعری میں بھی فنا کے بارے میں جابجا بیان کیا گیا ہے۔ شعر ملاحظہ کریں:

اس طرح روح بشر دست قضا لے جائے
جس طرح شمع کی لو موج ہوا لے جائے(41)

موت ایسی کیفیت ہے جس میں انسان کی روح پرواز کر جاتی ہے اور مٹی کا پتلا زمین پر رہ جاتا ہے۔ یہ موت پیچھے رہ جانے والے انسانوں کو دکھ کی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ اپنوں کی جدائی بہت اذیت ناک ہوتی ہے۔ یہ ایسی جدائی ہے جس میں وصل ممکن نہیں۔ موت ایک ظالم شے ہے جو اپنوں کو اپنوں سے جدا کر دیتی ہے۔ موت یہ نہیں دیکھتی کوئی جوان بیٹا اپنے والدین کو بے سہارا چھوڑ جائے گا، کوئی باپ اپنی اولاد کو یتیم کر دے گا یا کوئی شوہر اپنی عورت کو بیوہ کر دے گا۔ اس بارے میں قرآن پاک میں ارشاد باری تعالٰی ہے:

"اس زمین میں جو کوئی ہے فنا ہونے والا ہے اور صرف تمہارے پروردگار کی جلال والی اور فضل و کرم والی ذات باقی رہے گی۔"(42)

یہ موت کسی کی دوست نہیں۔ یہ اپنے مقررہ وقت پر انسان کی جان لے لیتی ہے اور پیچھے رہ جانے والوں کو بے سہارا چھوڑ جاتی ہے۔ یہ ایک مقرر اور مستقل شے ہے اس کا ہونا اٹل ہے۔ اسے کسی پر رحم نہیں آتا یہ عاشق کو محبوب سے جدا کرتی ہے۔ بچے بے سہارا ہو جاتے ہیں۔ باپ کی جدائی پر بیٹیوں کی آہ وبکا دیکھ کر دیکھنے والی آنکھ تڑپ اٹھتی ہے۔ دوسروں کا دل دکھ سے بھر جاتا ہے۔ سیّد انصر نے اسی موت کے دیے ہوئے غم کو اپنی شاعری میں اس طرح بیان کیا ہے:

اپنے تو اپنے غیر بھی بھرتے تھے سسکیاں
لپٹی ہوئی تھیں باپ کی میت سے بیٹیاں(43)

دنیا میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اس دنیا کو مستقل زندگی سمجھتے ہیں۔ خدا اور قیامت کو بھول جاتے ہیں۔ دنیا کے بادشاہ بن بیٹھتے ہیں اور لوگوں پر ظلم کرنا اپنا حق اولین سمجھتے ہیں۔ جیسے فرعون خود کو پوری دنیا کا بادشاہ بنا بیٹھا تھا۔ ایسے انسانوں کی ہدایت کے لیے پہلے پہل موسی جیسے نرم دل انسان بھیجے جاتے ہیں لیکن جن کے دل سخت ہوتے ہیں وہ کسی بھی بات کو نہیں سمجھتے۔ ایسے سخت دل لوگوں کا انجام موت ہے۔ ایسے ظالم لوگوں کے مظالم کو روکنے کے لیے موت بہترین ذریعہ ہے۔ مظلوم لوگوں کو ان کے صبر کا بدلہ ملتا ہے۔ ایسے معاشرے جن میں فرعون جیسے لوگ ہوں اسی معاشرے میں موسیٰ جیسے ہمدرد بھی بھیجے جاتے ہیں۔ سیّد انصر اس کو اپنی شاعری میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

پیدا ہوتا ہے اسی قوم میں موسی کا وجود
خوئے فرعون ہو جس قوم کے سرداروں میں(44)

یہ مال و دولت کسی کام نہیں آئے گی۔ دنیا کا یہ مال یہیں پر رہ جائے گا۔ یہ ہوس کے مارے لوگ یہیں ختم ہو جائیں گے۔ جس طرح خدائی کا دعویدار نمرود، مال و زر اور زمین کے خزانوں سے محبت کرنے والا قارون بھی اپنے خزانے ساتھ نہیں لے جا سکا۔ ان کے مال و زر بھی انہیں موت کی آغوش سے نہیں بچا سکے۔ وہ اسی دنیا میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر موت کے آغوش میں چلے گئے۔ موت نے ان کو دنیا کے لئے عبرت کا نشان بنا دیا کہ یہ مال و زر کی ہوس کسی کام کی نہیں۔ سیّد انصر اس کو یوں بیان کرتے ہیں:

زور و زر کا جنہیں دعوی تھا وہی تخت نشیں
زر کہیں ، زور کہیں ، تخت کہیں چھوڑ آئے(45)

یہ موت کسی کے لیے دکھ کا باعث بنتی ہے اور کسی کے لیے سکون کا سبب بنتی ہے۔ اردو ادب میں شعرا نے عاشق کے لیے موت کو خوشی کا باعث بتایا ہے۔ جب عاشق محبوب سے جدا ہو جاتا ہے تو اس جدائی میں ملے ہوئے کرب کا اختتام موت سے ہی ممکن ہے۔ اسی طرح عشق الٰہی میں مبتلا لوگ بھی دنیا کی زندگی کو عارضی سمجھتے ہیں اس لیے وہ موت کو بھی اپنا دوست سمجھتے ہیں۔ ان کے لیے موت تکلیف دہ شے نہیں بلکہ باعث راحت ہے۔ محبوب سے ملنے کا شوق، خدا سے ملنے کی تڑپ ان کو موت کے قریب کر دیتی ہے۔ انہیں موت دلکش محسوس ہوتی ہے جو انہیں اپنے محبوب سے ملانے کا سبب بنتی ہے۔ ایسے عاشق موت کا انتظار شوق

سے کرتے ہیں۔ موت کو ہنسی خوشی گلے لگانے کے لیے بے تاب رہتے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں شہید ہونا پسند کرتے ہیں۔ جیسے ہمارے فوجی ملک کی حفاظت کے لئے اللہ کی راہ میں قربان ہو جاتے ہیں یا مجاہدین اللہ کی راہ میں لڑتے لڑتے شہید ہو جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں ایسے لوگوں کو مردہ کہنے سے منع کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے جاتے ہیں, انہیں مردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں
لیکن تمہیں شعور نہیں"(46)

ایسے لوگوں کے لئے موت ظالم نہیں بلکہ محبوب شے ہے اور یہ محبت کا کرشمہ ہے جو ان کو محبوب حقیقی سے ملاتی ہے۔ یہ محبوب کے لیے وصال کا باعث ہوتی ہے جو اسے سکون و مسرت عطا کرتی ہے۔ عاشق خدا اپنے رب کی رضا حاصل کرنے کے لیے بخوشی جام شہادت نوش فرماتے ہیں۔ ان کے لیے یہ موت بھی جام بقا ہے جو انہیں دوام عطا کرے گی اور انہیں مستقل دائمی خوشی عطا کرے گی۔ سیّد انصر عاشق حقیقی کی موت کے بارے میں اس طرح لکھتے ہیں:

موت بھی ان کے لیے آب بقا ہے اے عشق
زندہ رہتے ہیں تیری راہ میں مرنے والے(47)

اس طرح موت دوسری زندگی کے جنم کا نام ہے انسان اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے اور ہمیشہ کی ابدی زندگی پا لیتا ہے۔ جو اس کی زندگی حاصل ہوتی ہے۔ موت جدائی کا نام ہے۔ اپنوں سے بچھڑنے کو بھی موت کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔ جب عاشق محبوب سے جدا ہو جاتا ہے تو اس جدائی میں ملے ہوئے کرب کا اختتام موت سے ہی ممکن ہے۔ اسی طرح عشق الٰہی میں مبتلا لوگ بھی دنیا کی زندگی کو عارضی سمجھتے ہیں اس لیے وہ موت کو بھی اپنا دوست سمجھتے ہیں۔

منافقت:

سیّد انصر کی شاعری میں منافقت کو بیان کیا گیا ہے۔ ان کے نزدیک دوغلے پن اور دورخ ہونے کو منافقت کہا جاتا ہے۔ منافقت ایک بہت بڑا معاشرتی المیہ ہے۔ منافق آدمی کسی کا دوست نہیں ہوتا۔ دوسرے لوگوں کو ذلیل و رسوا کرنا اور دھوکا دینا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ منافقین بظاہر ملنسار اور ہمدرد دکھائی دیتے ہیں مگر اندر سے بغض، کینہ اور حسد سے بھرے ہوتے ہیں۔ ایسا انسان بہت خطرناک ہوتا ہے جو بظاہر

دوست اور ہمدرد دکھائی دے لیکن کردار دشمنوں والا نبھائے۔ ایسے دروغ گو اور دھوکے باز شخص کو پہچاننا بہت مشکل ہے جو دوست بن کر دشمنوں جیسا کردار ادا کرے۔

آج ہمارے معاشرے کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ دروغ گوئی اور دوغلے پن سے کام لیا جاتا ہے۔ انسان کسی کے منہ پر کچھ اور ہے اور پیٹھ پیچھے کچھ اور ہے۔ ہر شخص ایک چہرے پر کتنے چہرے سجائے بیٹھا ہے۔ احمد ساقی منافقین کے متعلق یوں اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"ہر وہ شخص جس کے قول و فعل میں تضاد ہو وہ منافق ہے۔ منافق دور خہ ہوتا ہے۔ اپنے مفاد اور مطلب کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔ دوغلا پن اس کی نس نس میں سمایا ہوتا ہے" (48)

دھوکے باز منافق، سچے دشمن سے زیادہ خطرناک ہے۔ ایسا شخص دوسروں کے جذبات سے کھیلتا ہے کیونکہ وہ اسے دوست سمجھتا ہے۔ ایسے لوگ زبان پر وفاداری کے دعوے رکھتے ہیں جبکہ دل میں بغض رکھتے ہیں۔ بظاہر خوش گفتار، ملنسار اور بہت ہمدرد دکھائی دیتے ہیں مگر اندر سے بغض کینہ اور حسد سے بھرے ہوتے ہیں۔ یہ ایسے دشمن ہوتے ہیں جنہوں نے دوست کا روپ دھارا ہوتا ہے۔ عبداللہ بن ابی کو رئیس المنافقین کہا جاتا ہے۔ عبداللہ بن ابی بظاہر آپ کے ساتھیوں میں شامل رہا مگر باطنی طور پر کفار سے ملا ہوا تھا۔ وہ مسلمانوں کی تمام خبریں اور راز کافروں تک پہنچاتا تھا۔ کوئی ایسا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ جہاں پر مسلمانوں کا نقصان ہو سکتا تھا۔ آج کل منافقت اور دھوکے بازی اس قدر عام ہو چکی ہے کہ ایک بار لوگ کسی سے ناراض ہو جائیں تو بظاہر صلح کر لیتے ہیں لیکن دل سے بات نہیں مٹاتے بلکہ موقع کی تلاش میں رہتے ہیں کہ موقع ملے اور وہ دوسرے شخص کے خلاف کوئی چال چلیں اور اسے نقصان پہنچائیں۔

منافقت اس قدر عام ہو چکی ہے کہ شاذ و نادر ہی کوئی شخص اس سے دامن بچائے ہوئے ہے۔ اب لوگ ایک دفعہ کسی سے ناراض یا دور ہو جاتے ہیں تو پھر ان کا دوبارہ ملنا دشوار ہو جاتا ہے۔ در حقیقت لوگ بظاہر صلح کر لیتے ہیں مگر اپنے اندر کینہ و بغض کو پالتے رہتے ہیں جو کہ منافقت ہے۔ ایسے کچھ لوگ معصومانہ شکل بھی رکھتے ہیں جو معصوم شکل سے دھوکہ دے جاتے ہیں۔ سیّد انصر اس کو یوں بیان کرتے ہیں:

ہر شکل شریفانہ تو ہو سکتی ہے لیکن
ہر شخص حقیقت میں فرشتہ نہیں ہوتا (49)

سچی اور اصل صلح وہ ہے جو سچے دل سے کی جائے۔ اگر انسان بظاہر صلح کرلیں اور ایک دوسرے کو معاف بھی کر دیں لیکن باطن میں رنج پروان چڑھتا رہے تو اس پر منافقانہ رنگ چڑھ جاتا ہے جو انسان اور معاشرے کے لیے نقصان کا سبب بنتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایسے لوگ کثرت سے پائے جاتے ہیں جو بظاہر جانثاری کا دعوی کرتے ہیں لیکن دل ہی دل میں اس شخص کے لئے نفرت اور عداوت رکھتے ہیں۔ منافق بہت خطرناک ہوتا ہے۔ ایسے لوگ آستین میں چھپے سانپ جیسے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے کہ منافقین کو جہنم کے سب سے نچلے درجے میں ڈالا جائے گا۔ سیّد انصر بھی اس منافقت کو اپنی شاعری میں یوں بیان کرتے ہیں:

انصر یہ بھید مجھ پر بڑی دیر میں کھلا
انساں گزر رہا ہے تعصب کے دور سے(50)

تاریخ ایسے بہت سے واقعات سے بھری پڑی ہے کہ کس طرح اپنوں کی غداری کی وجہ سے اہل ایمان کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ٹیپو سلطان اپنوں کی غداری کی وجہ سے شہید ہوئے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے اہم اسباب میں سے ایک سبب اپنوں کی غداری اور منافقت بھی ہے۔ جب رہبر ہی رہزن بن جائیں اور حفاظت کرنے والے لٹیرے بن جائیں تو وہ معاشرہ یقینی طور پر زوال کا شکار ہو جاتا ہے۔

خواب وخیال:

خواب دیکھنا اچھی بات ہے۔ سید انصر بھی جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتے ہیں۔خواب نیند کی حالت میں آنے والی تصاویر ، آوازوں اور احساسات کے تجربات کو کہا جاتا ہے اور خیال بیداری کی حالت میں تصورات کا نام ہے۔ خواب دماغ کا وہ جادو ہے جو انسان کے لئے تب تک حقیقت کی صورت میں رہتا ہے جب تک آنکھ کھل نہ جائے۔ شعرانے بھی خواب کو شاعری میں موضوع سخن بنایا اور اسے مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔ خواب کو دو طرح سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ ایک سوتے ہوئے جن کا تعبیر سے تعلق ہوتا ہے اور ایک جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنا۔ اس میں ان کو پورا کرنے کے لیے محنت اور جذبہ درکار ہوتا ہے۔ انسان کی سب سے خوبصورت دنیا خوابوں کی دنیا ہوتی ہے جس میں وہ اپنی مرضی سے جی سکتا ہے۔ جو خواب پورے نہیں ہوتے ان کی تشنگی تمام عمر ساتھ رہتی ہے۔ جب انسان ساز گار ماحول میں رہتا ہے تو ان خوابوں کی یاد میں

رہتا ہے۔ اس طرح خیال شاعری میں لفظوں کی دلالت سے حاصل شدہ مقصد کا نام ہے۔ سیماب اکبر آبادی ابن خلدون کی شاعری کے متعلق بیان کرتے ہیں:

"ابن خلدون خیالات کو پانی سے تشبیہ دیتا ہے اور الفاظ کو پیالے سے وہ کہتا ہے کہ پانی سونے کے پیالے میں دیا جائے تو اس کی قدر بڑھ جاتی ہے اور مٹی کے پیالے میں دیا جائے۔ تو اس کی قدر گھٹ جاتی ہے۔ میرے خیال میں پانی بھی خوشگوار ہونا چاہیے اور پیالا بھی"(51)

عشق میں انسان ساتھ رہنے کے خواب دیکھتا ہے اور اس کی تعبیر کو پانے کے لئے وعدے کیے جاتے ہیں۔ لیکن جب نامرادی ملتی ہے تو تصورات و خیالات میں رہنا شروع کر دیا جاتا ہے۔ محبوب کے ساتھ دیکھے گئے خواب یاد آتے ہیں کہ کس طرح آئندہ کی زندگی کے لیے خوش کن خواب دیکھے تھے۔ شاعری میں ان خوابوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے کہ جب تنہائی میسر ہو تو ماضی کی یادوں میں کھو کر ان دنوں کی یاد میں کھو جاتا ہے جب محبوب ساتھ تھا۔ خواب و خیال کے انداز کو سیّد انصر نے اپنی شاعری کی زینت بنایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ تصورات کی دنیا میں بیٹھے اپنی تکمیل کی کوشش میں ہیں لیکن یہ سب صرف ایک خیال پر مبنی ہے۔ شعر ملاحظہ کریں:

میں تیری پیار بھری آنکھوں کا
خواب بن جاؤں گا پھر آؤں گا(52)

محبوب کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات موسم بہار کی طرح خوشگوار ہوتے ہیں اور اس کی یاد میں گزرے ہوئے لمحات کبھی مجسم بن کر سامنے آجاتے ہیں اور کبھی گل و مہتاب میں محبوب کا عکس نظر آتا ہے لیکن یہ سب تصورات کی حد تک ہوتا ہے۔ تمام خواب حسرت بن کر رہ جاتے ہیں اور حقیقت کے ساتھ ساتھ محبوب خیالات سے بھی دور ہو جاتا ہے۔ محبت میں انسان محبوب سے دوری کا تصور نہیں کرتا کیونکہ خواب جینے کی امید اور آگے بڑھنے کی امنگ بھی پیدا کرتے ہیں اور ان خوابوں کو پا لینے کی جدوجہد دل میں ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ شعر ملاحظہ کریں:

خیال و خواب کے دیوار و در بنائے ہوئے
ہوا کے دوش پہ بیٹھا ہوں گھر بنائے ہوئے(53)

زندگی کئی خوبصورت تصورات کے گرد گھومتی ہے جن کی تکمیل کے لیے جدوجہد کی جاتی ہے۔ بعض خواب اپنی حقیقت پر مبنی دنیا میں مکمل ہو جاتے ہیں اور بعض ہوا کے جھونکوں کے ساتھ اڑ جاتے ہیں۔ خواب وخیال انسانی زندگی کا حصہ ہیں۔ اس میں کھو کر انسان حقیقی دنیا کو بھول جاتا ہے۔ یہ دنیا بہت خوبصورت دکھائی دیتی ہے کیونکہ اس میں ہر چیز انسان کو اپنی دسترس میں دکھائی دیتی ہے۔ یہ خواب وخیال ہمیشہ مثبت ہونے چاہییں۔

دہشت گردی:

دہشتگردی ایک خطرناک جنگ ہے۔ جس نے تمام دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ پوری دنیا میں کھلم کھلا قتل وغارت عام ہے۔ آئے روز دہشت گردی سے متعلق نت نئی خبریں ہر ملک سے ملتی ہیں۔ کچھ سالوں سے ہمارا پاکستان بھی اسی دہشت گردی کی لپیٹ میں آیا ہوا ہے۔ ہمارے پاکستانی اخبارات میں بھی آئے روز دہشت گردی سے متعلق نت نئی خبریں ملتی ہیں۔ جس میں کسی آدمی یا نوجوان لڑکے نے خودکش بم دھماکے میں خود کو اڑا لیا۔ ان خودکش بمباروں میں میں زیادہ تر غریب اور یتیم بے سہارا لوگ شامل ہوتے ہیں۔ ایسے غریب طلبا جن کو ان کے والدین پڑھنے کے لئے دینی مدارس میں بھیجتے ہیں، مدارس والے انہیں غلط تعلیم دیتے ہیں۔ ان دہشت گرد نما عالموں کی تعلیم و تربیت سے وہ بچے بڑے ہو کر عالم فاضل بننے کی بجائے دہشتگرد بنتے جا رہے ہیں۔ اس میں زیادہ تر دشمن عناصر کا ہاتھ ہے۔ کچھ دشمن عناصر ان درس گاہوں میں چھپے ہوتے ہیں جو مذہب کی آڑ میں ان بچوں کو غلط تعلیم و تربیت دیتے ہیں۔

جو درسگاہیں مذہبی تعلیم کی آماجگاہ ہوا کرتی ہیں جن میں محبت و شفقت کا درس دیا جاتا ہے جب ان درسگاہوں میں ہی قتل وغارت جیسی تعلیم دی جائے گی، بچوں کے معصومانہ ذہنوں میں تعصب بھر دیا جائے گا اور ان کے دل میں مسلمانوں کے خلاف نفرت بھر دے جائے گی تو پھر ان کو کیسے سیدھی راہ پر لایا جا سکتا ہے۔ کون باہمت انسان یا مرد مومن ان کو سیدھی راہ پر لانے کے بارے میں سوچے گا۔ اس کے لیے انفرادی طور پر حکومت وقت اور اجتماعی طور پر تمام لوگوں کو محنت کرنا پڑے گی۔ سیّد انصر نے بھی اپنی شاعری میں ایسی درسگاہوں پر اظہار افسوس کرتے ہوئے بات کی ہے:

انہیں سدھانے کی تدبیر کون سوچے گا
جنہیں درندہ بنا دیا ہے درسگاہوں نے(54)

پچھلے کچھ سالوں میں دہشت گردی کے ایسے واقعات رونما ہوئے کہ لوگ مساجد اور گھروں سے باہر نکلنے سے ڈرنے لگے۔ نمازی نماز پڑھنے جاتے اور دوسرے لوگوں کے کندھوں پر لاشیں بن کر واپس لوٹتے یا لاشوں کے کچھ حصے ہی واپس آتے۔ اس دہشت گردی سے ملک میں خوف وہراس پھیل گیا۔ اس دکھ بھری کیفیت پر سیّد انصر نے بھی قلم اٹھایا اور اسے اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔ ایسی عدل گاہیں جن کو امن وسکون کی علامت سمجھا جاتا ہے وہ بے گناہ لوگوں کے خون سے رنگ دی گئیں۔ انہی عدل گاہوں میں قاتل چھپے ہوتے ہیں۔ جو چھپ کر اپنا وار کرتے ہیں۔ جب ان انصاف کی جگہوں پر مظلوموں کا خون شامل ہو جائے تو وہ عدل گاہیں نہیں رہتیں۔ جہاں انصاف کا قتل کیا جائے، جہاں معصومیت چھین لی جائے اور قلم کی جگہ ہتھیار ہاتھوں میں دیے جائیں وہ عدل گاہوں کے نام پر قتل گاہیں ہیں۔ اس میں لوگ مذہب کی آڑ میں چھپ کر وار کرتے ہیں۔ سیّد انصر کا دل بھی ان تمام واقعات سے بہت متاثر ہوا ہے۔ جنہیں وہ اپنی شاعری میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

ہمارے خون سے رنگین ہے جس کا ہر ذرہ
وہ قتل گاہ بھی واقع ہے عدل گاہ کے ساتھ(55)

جس طرح لال مسجد آپریشن میں افغانستان سے آئے ہوئے طالبان مذہب کی آڑ میں طالبات کو دہشت گردی کی تعلیم دیتے رہے اور اس بنا پر پر فوج اور طالبان کا آمنا سامنا ہوا۔ ایک دوسرے پر گولیاں برسائی گئیں۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ سانحہ پشاور ہے جو آرمی پبلک اسکول پشاور میں رونما ہوا۔ جس میں تحریک طالبان کے نام سے نوجوانوں نے بہت درندگی سے معصوم بچوں اور اساتذہ کو شہید کر دیا۔ ایسے واقعات پر ہر آنکھ اشکبار تھی لیکن یہ پتھر دل لوگ قتل کرنے کے بعد بھی پشیمان نہیں تھے۔ اس طرح شدت پسندوں نے مذہب کی آڑ میں دہشتگردی کو فروغ دیا۔ ننھے معصوم بچے درسگاہوں میں مذہبی تعلیم حاصل کرنے آئے تھے لیکن ان کو دہشت گردی کی تعلیم و تربیت دی گئی۔ جس سے ان کے دل میں دوسروں کے خلاف بغض، حسد، نفرت وعداوت اور تعصب نے جنم لیا۔ وہ دوسروں کو قتل کرتے ہوئے خود کو شہید تصور کرتے ہیں۔ اس صورتحال پر مختلف ادیبوں کے ساتھ ساتھ سیّد انصر نے بھی قلم اٹھایا ہے۔ شاعر چونکہ معاشرے کا حساس طبقہ ہوتا ہے اس لئے ان کا ایسے واقعات سے متاثر ہونا فطری سی بات ہے۔

غربت و افلاس:

غربت کسی معاشرے میں بھوک و افلاس کا نام ہے۔ ایسے افراد جن کے پاس کھانے کے لئے مناسب مقدار میں روٹی نہ ہو اور ضروریات زندگی پوری کرنے کے لیے مناسب مقدار میں دولت نہ ہو وہ غربا کہلاتے ہیں۔ غربت کی بہت سی وجوہات ہیں۔ جن میں لوگوں کا کم پڑھا لکھا ہونا، معاشی ناہمواری، محنت سے جی چرانا، ہنر کی کمی، جنگیں اور قدرتی آفات وغیرہ شامل ہیں۔ جو غریب طبقے پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہیں۔ بہت سے غریب لوگ غربت کی وجہ سے خودکشی کر لیتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے بیوی بچوں سمیت خودکشی جیسے گناہ کا مرتکب ہو کر موت کو گلے لگا لیتے ہیں۔ جب غربا کو کھانے کے لئے وقت پر مناسب مقدار میں کھانا نہ ملے تو کچھ لوگ بھیک جیسی لعنت میں ملوث ہو جاتے ہیں۔ بعض لوگ اپنی بھوک مٹانے کے لیے چوری، ڈاکہ اور قتل و غارت پر اتر آتے ہیں۔ لیکن بعض غیرت مند لوگ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا یا کسی سے چھین کر کھانا گوارا نہیں کرتے۔ وہ غربت سے لڑائی کا بہترین ذریعہ خودکشی کو ہی سمجھتے ہیں۔ اسی میں انہیں غربت سے نجات کا بہترین ذریعہ نظر آتا ہے۔ غریبوں کی ایسی حالت زار پر جہاں مختلف ادیبوں نے قلم اٹھایا ہے وہاں سیّد انصر کا قلم کیسے خاموش رہ سکتا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

بڑے عجیب ہیں انصر یہاں کے مفلس بھی
میسر آئی نہ روٹی تو زہر کھانے لگے(56)

سیّد انصر نے معاشرے میں پائی جانے والی غربت کو بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ غربت ایسی بیماری ہے جس کی وجہ سے بیٹیاں والدین کے گھروں میں بیٹھی بوڑھی ہو جاتی ہیں اور کوئی ایسا شہزادہ نہیں آتا جو بغیر جہیز کے انہیں بیاہ کر لے جائے۔ معصوم بیٹیاں جنہوں نے بچپن سے شہزادوں کے خواب دیکھے ہوتے ہیں کہ کوئی شہزادہ آ کر ان کو مشکل حالات سے نکال لے گا وہ ان شہزادوں کی راہ تکتے تکتے بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ ایسی بیٹیوں کے دکھی دل سے جو آہ نکلتی ہے ان کے درد کو محسوس کرتے ہوئے سیّد انصر نے اسے اپنی شاعری میں بیان کیا ہے۔ کس طرح نادار گھروں کی بیٹیاں پریشان ہو کر خود کلامی کرتی ہیں کب کوئی شہزادہ انہیں اپنے گھر کی زینت بنا کر ڈولی میں بٹھا لے جائے گا یا پھر وہ مر کر ہی باپ کے گھر سے رخصت ہوں گی۔ جبکہ امیر طبقے کی لڑکیوں کے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا وہ آزادانہ اپنی مرضی سے جب چاہیں شادی کر سکتی ہیں۔ دولت کی ریل پیل سے انہیں ہر کام میں آسانی ہوتی ہے۔ غریب بیٹی کے المیے کو سیّد انصر اس طرح بیان کرتے ہیں:

نادار گھر کی بیٹیاں اس مخمصے میں ہیں
اب یتیمیں اٹھیں گی یا اٹھیں گی ڈولیاں(57)

غریب لوگ ہر طرح سے غربت میں مارے جاتے ہیں۔ غربت کی چکی ان کو ہر طرح کے مظالم برداشت کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ امیر لوگ اپنی امارت کے نشے میں غریبوں کا قتل بھی آسانی سے کر دیتے ہیں کیونکہ انہیں معلوم ہے غریب کی سننے والا کوئی نہیں۔ وہ خود قتل کر کے اس کا الزام غریب لوگوں پر لگا دیتے ہیں اور ہر ثبوت مٹا دیتے ہیں۔ انہیں اس بات کا یقین ہے کہ کوئی ایسا منصف نہیں جو انہیں سزا دے سکے۔ وہ دولت سے ہر بازی پلٹ سکتے ہیں کیوں کہ ایسے ظالم امیر لوگ پیسوں سے جھوٹے گواہ خرید لیتے ہیں یا پھر گواہوں کو پیسے دے کر اور انہیں ڈرا دھمکا کر ان کا منہ بند کروا دیتے ہیں کہ وہ سچ بیان نہ کر سکیں۔ اس طرح وہ اپنی مرضی کا فیصلہ کرواتے ہیں۔ سیّد انصر اس کو یوں بیان کرتے ہیں:

سزا سنائے گا مجھے کیوں کر میرا منصف
میرے خلاف اگر کوئی بھی گواہی نہ ہو(58)

لیکن دنیا کے ان منصفوں سے بڑا منصف ایک خدا کی ذات بھی ہے جسے یہ امیر لوگ اپنی دولت کے نشے میں بھول بیٹھے ہیں۔ ایسا غریب شخص جو قتل کر دیا جاتا ہے اس کی بیوہ کو انصاف نہیں ملتا تو وہ خدا کے حضور اپنے انصاف کے لیے التجائیں کرتی ہے۔ اس بیوہ کا رونا تڑپنا قاتل کے لیے بد دعاؤں اور آہوں کا سبب بنتا ہے۔ اس طرح مظلوم بیوہ کی آہ سے قاتل کو اس کا اپنا بھائی ہی جائیداد کے لیے قتل کر دیتا ہے۔ اس طرح قاتل غریب مظلوم کے ہاتھوں سے نہیں بلکہ اپنے ہی بھائی کے ہاتھوں دولت کی آڑ میں مارا جاتا ہے۔ ایسے مظلوم لوگوں کو خدا سے انصاف ملتا ہے۔ سیّد انصر اس کو یوں بیان کرتے ہیں:

قاتل کو قتل کر دیا اپنے ہی بھائی نے
لو کتنا کام کر گئیں بیوہ کی سسکیاں(59)

بعض اوقات غربت و افلاس انسان کی دنیا تباہ کرنے کا سبب بھی بن جاتی ہے۔ غریب انسان مجبوری و لاچاری میں ایسے گناہ بھی کر جاتا ہے جو وہ نہیں کرنا چاہتا۔ اس کی غربت اسے دوسروں کے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اسے اپنی انا اور خودی کو مارنا پڑتا ہے۔

حبُ الوطنی:

حب الوطنی سے مراد وطن کی محبت ہے۔ جس جگہ انسان پیدا ہوتا ہے، پلتا، بڑھتا اور کھیلتا کودتا ہے، وہ گلی، وہ خطہ اور وہ سرزمین اس کا وطن کہلاتی ہے۔ وطن سے محبت فطری بات ہے۔ ملک سے باہر جاکر کوئی فرد جتنا چاہے وطن کی محبت سے انکار کرے۔ پھر بھی اس کے دل کے کسی کونے میں وطن کی محبت ضرور چھپی ہوتی ہے۔ جو کسی نہ کسی موقع پر غیر ارادی طور پر سامنے آجاتی ہے۔ وطن سے محبت انسان کی رگوں میں شامل ہوتی ہے۔ ہر انسان جس کے پاس دل ہوتا ہے وہ دوسرے انسانوں سے محبت کرتا ہے اور ساتھ ساتھ اپنے وطن سے بھی محبت کرتا ہے۔ کسی کے دل میں یہ محبت کم ہوتی ہے اور کسی کے دل میں زیادہ لیکن یہ محبت موجود ضرور ہوتی ہے۔ بعض لوگوں کے دل حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہوتے ہیں جو اپنی جان پر اپنے وطن کو ترجیح دیتے ہیں۔ اپنے وطن کے ساتھ ساتھ اپنے ملک کے رہنے والے تمام لوگوں سے محبت کرتے ہیں۔ وطن سے محبت بہت بڑی نعمت ہے ایسی نعمت کہ جس میں انسان سکون محسوس کرتا ہے۔

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اپنے وطن مکہ مکرمہ سے بہت محبت تھی۔ جب وہ مکہ کو چھوڑ کر مدینہ ہجرت کر رہے تھے۔ تب نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وطن کے لیے محبت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

"اے مکہ تو کتنا پیارا شہر ہے۔ تو مجھے کس قدر محبوب ہے۔ اگر میری قوم مجھے تجھ
سے نہ نکالتی تو میں تیرے سوا کسی دوسرے مقام پر سکونت اختیار نہ کرتا"(60)

انسان کو اپنا گھر بہت عزیز ہوتا ہے۔ اپنا گھر اسے جنت لگتا ہے۔ وہ جہاں کہیں بھی ہو اسے اپنے گھر میں ہی سکون ملتا ہے۔ جہاں اس کے ماں باپ بہن بھائی عزیز و اقارب رہتے ہوں، جہاں اس نے بچپن گزارا ہو وہ جگہ اسے بہت محبوب ہوتی ہے۔ محب وطن جہاں بھی چلے جائیں وطن کی محبت انہیں بے چین رکھتی ہے اور انہیں واپس اپنے ملک میں کھینچ لاتی ہے۔ وطن کی مٹی کی کشش انہیں مجبور کرتی ہے کہ وہ واپس اپنے ملک میں اپنے پیاروں کے پاس آجائیں۔ اسی لیے وہ اپنے وطن کو چھوڑ کر کہیں اور آباد نہیں ہو پاتے۔ وطن کی مٹی کی خوشبو انہیں اس گھر سے جانے نہیں دیتی۔ اسی طرح سیّد انصر کو بھی اپنے وطن عزیز سے بہت محبت ہے۔ وہ وطن سے محبت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

کھینچ لاتی ہے ہمیں گھر کی کشش
لوٹ آتے ہیں جدھر جاتے ہیں ہم(61)

وطن بھی ایک گھر کی مانند ہے جسے سب نے مل کر سجانا سنوارنا ہوتا ہے۔ جس طرح اپنے گھر کی سجاوٹ اور بناوٹ میں محنت کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح ملک کے ہر خطے کو سجانا سنوارنا اور اس ملک کے ہر حصے کی حفاظت کرنا ہمارا فرض اولین ہے۔ اپنے ملک کی حفاظت کرنا اسی طرح ضروری ہے جس طرح اپنے گھر کی حفاظت کرنا۔ حب الوطنی میں اپنے ملک کی حفاظت کرتے ہوئے اپنے خون کا نذرانہ پیش کرنا بھی اعلیٰ نصب العین ہے۔ وطن کی بہتری کے لیے اور اس کے خوبصورت خطوں کی حفاظت کے لیے محب وطن اپنا لہو دینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ وطن سے محبت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اس خطے کو خوبصورت بنایا جائے، اس کی حفاظت کی جائے اور اس کے لیے محنت کی جائے۔ ہر کام کو دیانتداری اور لگن سے سرانجام دیا جائے۔ اس کے لیے چاہے خون پسینہ ایک کرنا پڑے۔ وطن کے لیے دیا گیا خون کبھی رائیگاں نہیں جاتا۔ وطن کی محبت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ شر پسند عناصر سے بچا جائے۔ سیّد انصر اس بارے میں لکھتے ہیں:

خاک گلشن تیری زرخیزی کی خیر
لے تجھے اپنا لہو دیتے ہیں ہم(62)

وطن اسے معاشی، معاشرتی اور روحانی سہولیات جیسے کھانا، مکان، صحت، تعلیم و تدریس، تفریح، شناخت، تہذیب و تمدن اور امن وامان وغیرہ فراہم کرتا ہے۔ ان عناصر کو دیکھتے ہوئے ہر شہری کے دل میں حب الوطنی پیدا ہونا لازم ہے۔ محب وطن اپنے وطن عزیز کی سربلندی کے لئے جان دینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ملک پر کوئی مصیبت آجائے تو وہ اپنی جان دے کر بھی اس مشکل سے نبرد آزما ہوں گے۔ وطن کے سچے بہادر لوگ سولی پر چڑھ کر بھی ہمیشہ حق کی بات کرتے ہیں۔ محب وطن حق بات کہنے سے نہیں گھبراتے کیونکہ عزت سے رہنا اور سر اٹھا کر جینا انہیں وطن عزیز نے سکھایا ہے۔ سیّد انصر بھی سچے محب وطن ہیں۔ وہ اپنے ملکی وقار کے لیے ہمیشہ حق کی بات کہتے ہیں۔ اس بارے میں وہ لکھتے ہیں:

مقام امتحاں آئے تو جان پر کھیل جاتے ہیں
اہل حق سناں پر بھی کلام حق سناتے ہیں(63)

اپنے گھر، اپنے وطن اور اپنی سرزمین پر رہتے ہوئے آسمان پر نظر رکھی جائے یعنی دور تک عقابی نظریں ہوں جو دشمن کے عزائم کو پہچان سکیں اور اپنے آشیانے کے ہر تنکے کو دشمن عناصر کی بد نظروں سے بچا سکیں۔ اپنے ملک کے ہر حصے کو شر انگیزی سے بچایا ہو گا۔ فتنہ انگیز جو چھپ کر وطن کے لوگوں کی آپس میں فتنہ انگیزی کرواتے ہیں ان سے بچ کر رہنا ہو گا۔ اپنے ملک میں امن وسکون رکھنا ہو گا۔ اپنے ملک کو جنت بنانا

ہو گا۔ بلند نظری سے ہی اپنے ملک کو خوشحالی کی طرف راغب کیا جا سکتا ہے۔ دشمن کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر آگے بڑھنا ہو گا۔ سیّد انصر نوجوانوں کو حب الوطنی کی ترغیب دیتے ہوئے کہتے ہیں:

بچا کے برق سے خاشاک آشیاں رکھو
رہو زمیں پہ نظر سوئے آسماں رکھو(64)

انسان کی پہچان اس کے ملک اور وطن سے ہوتی ہے۔ وطن اسے قومیت عطا کرتا ہے۔ اسی قومیت سے وہ پوری دنیا میں پہچانا جاتا ہے۔ وطن کی سرزمین پر رہتے ہوئے آسمان پر نظر رکھنا حب الوطنی کا حصہ ہے کیونکہ آسمان پر نظر رکھنا ملک کی بہتری کے لیے کام کرنا ہے۔ جب محب وطن کی اڑان اونچی ہو گی تو دشمن پر نظر رکھنا بھی آسان ہو گا۔ ہر وقت دشمن کے عزائم سے چوکنا رہنا اور ملک کی حفاظت کے لئے تیار رہنا حب الوطنی کا تقاضا ہے۔

ہوس:

ہوس کے معنی شدید خواہش، شوق، تمنا، لالچ، رغبت اور خواہش نفسانی کے ہیں۔ کسی بھی چیز کی زیادتی ہوس کے زمرے میں آتی ہے۔ حد سے زیادہ کسی بھی چیز کی طلب حرص کہلائے گی جو کہ سراسر نقصان کا باعث ہوتی ہے۔ جس طرح حضرت آدم علیہ السلام کو جنت میں موجود درخت کے پاس جانے سے منع کیا گیا۔ شیطان کے بہکاوے میں آکر ان کے دل میں اس درخت کا پھل کھانے کی شدید خواہش پیدا ہوئی۔ اس ہوس نے انہیں جنت سے لاکر زمین پر لا کھڑا کیا۔ اس ہوس نے ان سے جنت میں ملی عیش و عشرت چھین لی۔

کچھ لوگ ہوس کو عشق و محبت کا نام دیتے ہیں جبکہ محبت ایک خالصتاً پاکیزہ جذبہ ہے۔ جس میں محبوب کو پاکیزہ نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ جس طرح محبوب پر کسی دوسرے کی گندی نظر برداشت نہیں کی جا سکتی۔ اس طرح خود بھی محبوب کی طرف پاکیزہ نظروں سے دیکھنا محبت ہے۔ اس کی عزت کو داغدار کرنے کی بجائے اس کی آبرو کی حفاظت کرنا، اسے نکاح جیسے پاکیزہ بندھن میں باندھ لینا محبت ہے۔ جو نظریں ہوس آلودہ ہوں وہ نفسانی خواہشات کو تو پورا کر سکتی ہیں لیکن وہ محبت کبھی نہیں ہو سکتی۔ محبت میں بغیر کسی شرعی رشتے کے ناجائز تعلق قائم کرنا ہوس ہے۔ کچھ ہوس زدہ لوگ محبت کا چکما دے کر دوسروں کی عزت لوٹتے ہیں۔ سیّد انصر نے اس موضوع پر یوں لکھا ہے:

ہوس آلود محبت کے سہارے کچھ لوگ
گھر کی دہلیز پہ لے آئے خریداروں کو(65)

ایسے لوگ جو محبت کے نام پر معصوم لڑکیوں کو ورغلاتے ہیں، ان کی عزت لوٹتے ہیں، ایسے لوگ عزتوں کے محافظ نہیں بلکہ لٹیرے ہیں۔ ان کی ہوس اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ وہ خود تو عزت لوٹتے ہی ہیں اس کے ساتھ ساتھ وہ ان لڑکیوں کی عزتوں کو آگے بھی بیچنا شروع کر دیتے ہیں۔ کچھ بیٹیاں والدین کی عزت داؤ پر لگا کر محبت کے نام پر ہوس کا شکار ہو جاتی ہیں۔ ہوس انسان کو ذلیل ورسوا کرتی ہے۔ کچھ لوگ پیسہ کمانے کے لیے بھی عزت بیچتے ہیں۔ ہوس آلود نگاہیں عزت بیچنے والوں کے در پر چلی جاتی ہیں۔ وہ پیسے دے کر اپنی ہوس پوری کرتے ہیں اور جسمانی لذت حاصل کرتے ہیں۔ ہوس زدہ لوگوں کو ان کی ہوس وقتی طور پر لذت فراہم کرتی ہے لیکن بعد میں یہ مستقل بے چینی کا سبب بنتی ہے جو انسان کو تباہ وبرباد کر دیتی ہے۔

جنسی ہوس کے علاوہ کچھ لوگوں میں پیسہ جمع کرنے کی ہوس پائی جاتی ہے۔ وہ غیر قانونی دھندے سے حلال و حرام کی تمیز کیے بغیر پیسہ اکٹھا کرنے کی دھن میں لگ جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک حلال و حرام کی کوئی تمیز نہیں رہتی۔ ان کا مقصد صرف پیسہ جمع کرنا ہوتا ہے۔ ان کا لالچ ان کی طمع ان کو بے سکون رکھتی ہے اور وہ شدید سے شدید تر کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ان کا دل ہمیشہ پیسے کی طرف لپکتا ہے اور دماغ بھی انہی باتوں میں الجھا رہتا ہے کہ کس طرح پیسہ اکٹھا کیا جائے۔ وہ کوئی بھی ایسا دھندا کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں جس سے انہیں زیادہ فائدہ ملے۔ چاہے وہ قانونی ہو یا غیر قانونی۔ اس لالچ میں وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ ان کا لالچ، ان کا روپیہ پیسہ ان کی جان، سب کچھ اسی دنیا میں رہ جائے گا۔ دنیا کا مال دنیا میں ہی رہ جائے گا اس لیے جتنا مال مل جائے اسی پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اس سے مال میں برکت پیدا ہوتی ہے اور مال کی ہوس ختم ہوتی ہے۔ سیّد انصر کو دنیا کے اس مال و دولت سے کوئی غرض نہیں۔ وہ اس حالت سے خود کو آزاد محسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

تیرے بغیر بھی زندہ ہیں کتنے لوگ یہاں
سو کس لئے زرِ دنیا تیری ہوس میں رہوں(66)

لالچ کے چکر میں انسانوں کی غیرت مر جاتی ہے۔ وہ اپنا ایمان اور عزت سب کچھ داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ وہ انسانیت کو چھوڑ کر درندگی پر اتر آتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنی ہوس پوری کرنے کے لیے بچوں کو بھی نہیں چھوڑتے۔ ایسے ہوس زدہ لوگ مردہ خانوں میں پڑی ہوئی لاشوں کے سوا کچھ نہیں ہیں کیونکہ جن کے دل پتھر

ہو چکے ہوں وہ گونگے، بہرے اور اندھے ہیں۔ وہ کچھ بھی سوچنے اور سمجھنے سے قاصر ہیں۔ جس کی غیرت مر جائے اس کے پاس باقی کچھ نہیں بچتا۔ ایسے انسان مردہ لاشوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ سیّد انصر ایسے لوگوں کو مردہ تصور کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مرگ غیرت کیا کہیں کیسے ہیں ہم
سرد خانوں میں پڑے لاشیں ہیں ہم(67)

آج کل کے معاشرے میں ظاہری رکھ رکھاؤ اور ظاہری بناوٹ بہت بڑھ گئی ہے۔ جس وجہ سے شان و شوکت کی ہوس دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ جس کی وجہ سے ہر شخص دوسرے شخص کے خون کا پیاسا ہے۔ خون سفید ہو گیا ہے اور محبت و مروت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اس کی جگہ منافقت نے لے لی ہے۔ اسی طرح کچھ لوگوں کو ظاہری رکھ رکھاؤ اور دنیاوی بناوٹ کی حرص ہوتی ہے۔ دوسروں کی دیکھا دیکھی معصوم و سادہ دل لوگوں میں بھی امیر بننے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ وہ بھی اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ امیر لوگوں سے ان کی دوستی ہو اور وہ بھی ان کی عزت کریں۔ کیونکہ غریب سادہ لوح جب معاشرے میں فقیرانہ زندگی بسر کرتے ہیں تو امیر لوگ ان کا مذاق اڑاتے ہیں اور ان کی غربت انہیں عزت سے جینے نہیں دیتی۔ وہ مجبوراً امیروں جیسی شان و شوکت بڑھانے کے چکر میں دولت کی ہوس میں لگ جاتے ہیں۔ سیّد انصر اس بارے میں لکھتے ہیں:

جنہیں متاعِ فقیری پہ ناز تھا کل تک
انہیں بھی ہوگئی رغبت کلاہ و جاہ کے ساتھ(68)

ہوس سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔ اس سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ کسی بھی چیز کو اپنے اوپر حاوی کر لینا اور اس کے حصول کی ہر ممکن کوشش کرنا ہوس کے زمرے میں آتا ہے۔ جو انسان کی بربادی کا ساماں پیدا کرتی ہے۔ شکر گزاری اور قناعت انسان میں ہوس کو ختم کرتی ہے اس لیے دل میں جو چیز حاصل نہیں ہوئی اس پر کڑھنے کی بجائے حاصل پر شکر ادا کیا جائے۔

سیاست:

سیاست کسی گروہ کی بنائی گئی اس پالیسی کو کہا جا سکتا ہے جس کا مقصد اپنی بالادستی کو قائم کرنا ہے۔ سیاست کئی قسم کی ہو سکتی ہے۔ جس میں اقتدار حاصل کرنے، ذاتی مفاد حاصل کرنے، مذہبی اقدار کے تحفظ

اور جمہوری روایات کے تحفظ کی سیاست شامل ہے۔ ہمارے ملک میں آج کل کی سیاست صرف ذاتی مفاد اور اقتدار حاصل کرنے پر مشتمل ہے۔ آج کل ہر کوئی اقتدار حاصل کرنے کے لیے سیاست میں ملوث ہونے کے چکر میں ہے۔ ملک کی سیاسی صورتحال ہر دوسرے دن بدلتی رہتی ہے۔ ہماری حکومت سیاست کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنی ہوئی ہے۔ سیاسی طبقہ حکومت کو اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا ہے۔ یہ سیاست خاندانی وراثت کی طرح منتقل ہوتی رہتی ہے۔ پاکستان میں بھی موروثی سیاست پائی جاتی ہے۔ یہ سیاست صرف اعلیٰ طبقے یعنی قومی یا صوبائی اسمبلیوں تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ نچلے طبقے میں بھی پھیلی ہوئی ہے۔ اس طرح یہ سیاست دان ملک میں مستقل طور پر اپنی اجارہ داری قائم کر لیتے ہیں۔

سیاسی لوگ کسی کے سگے نہیں ہوتے۔ یہ اپنا مطلب نکالنے کے لیے عوام کو چکمہ دیتے ہیں۔ انہیں بڑے بڑے خواب دکھا کر ان سے ووٹ وصول کرتے ہیں اور جب خود کسی عہدے پر فائز ہو جاتے ہیں تو عوام کو دکھائے گئے حسین خواب بھی انہیں بھول جاتے ہیں۔ غریب عوام سیاسی لیڈروں کے ہاتھوں بے وقوف بننے پر مجبور ہے جو ان کی چکنی چپڑی باتوں میں آجاتی ہے۔ ان کا منافقانہ دوستانہ رویہ عوام کو بے وقوف بناتا ہے اور لوگ ایسے سیاست دانوں کے ظاہری رویے سے متاثر ہو کر انہیں لیڈر بنا لیتے ہیں۔ کچھ علاقوں میں جاگیر دارانہ نظام کی حکمرانی ہے۔ معصوم عوام ان گدی نشینوں سے بہت عقیدت رکھتے ہیں۔ ان کے سامنے حق بات کہنے اور باطل سے انکار کرنے کی بھی جرات نہیں کرتے چاہے وہ غدار وطن دشمن سے ملے ہوئے ہوں۔ اس طرح غریب عوام سب کچھ جانتے ہوئے بھی دوستی اور عقیدت کی بنا پر انہیں حکمران تسلیم کر لیتی ہے اور انہیں تختِ شاہی پر بیٹھا دیتی ہے جو کہ ملک و قوم کے لئے سراسر نقصان کا باعث ہے۔ ایسے غدار وطن دشمن کے ہاتھوں کٹھ پتلی ہوتے ہیں اور دشمن ان سے اپنی مرضی کے فیصلے کرواتا ہے۔ اس طرح یہ دشمنوں کے نمک خوار ملک کی خیر خواہی کی بجائے ملکی نقصان کا باعث بنتے ہیں۔ سیّد انصر اس بات کو یوں بیان کرتے ہیں:

ہم بھی کیا شے ہیں عقیدت سے بٹھا دیتے ہیں
مسندِ شاہی پہ دشمن کے نمک خواروں کو(69)

سیاسی لیڈر جب اپنی مرضی کا عہدہ حاصل کر لیتے ہیں تو وہ عوام سے کئے ہوئے وعدے بھول جاتے ہیں۔ انہیں صرف اپنی عیش و عشرت اور آرام سے غرض ہوتی ہے۔ ان کے پاس اتنا بھی وقت نہیں ہوتا کہ غریب انسان کی بات ہی سن لی جائے کجا کہ ان کی مدد کرنا۔ ان کو عوام کی غربت اور تنگدستی کا بالکل بھی

احساس نہیں۔ ایسے لوگ حکمران بننے کے اہل ہی نہیں جنہیں اپنی رعایا کی مشکلات کا اندازہ نہ ہو۔ ایسے لالچی لوگ اس قابل بھی نہیں ہوتے کہ غریبوں کی ضروریات زندگی پوری کرنے کے لیے چند سکے ادا کرسکیں۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ مجبور عوام اس غربت سے تنگ آکر خودکشی یا مختلف جرائم کا ارتکاب کرتی ہے۔ پاکستان میں بڑھتے ہوئے جرائم کی شرح کے اسباب میں سے سب سے بڑا سبب غربت ہے۔ ایسے حکمرانوں کو تخت شاہی پر بٹھانے کی بجائے ان کے درباروں کو آگ لگادی جائے تو وہی بہتر ہے جو خود تو عیش بھری زندگی گزارتے ہیں اور عوام کے لیے ان کے پاس جھوٹے لفظوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ سیّد انصر اس بات پر شدید برہم ہوتے ہوئے لکھتے ہیں:

پھونک دو ایسے شہنشاہوں کے درباروں کو
جہاں خیرات بھی ملتی نہیں ناداروں کو(70)

سیاسی لیڈروں میں بہت منافقت اور دوغلہ پن پایا جاتا ہے۔ اپنے فائدے کے لئے کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ انتخابات کے دنوں میں یہ غریب سے غریب بندے کو بھی سلام کررہے ہوتے ہیں لیکن جیسے ہی کوئی سیاسی عہدہ حاصل کرلیتے ہیں اپنے ہمسائے کی پہچان سے بھی منکر ہوجاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی حقیقت جب کچھ بہادروں پر عیاں ہوتی ہے تو وہ ان کی غلامی کرنے سے انکار کردیتے ہیں۔ کچھ بہادر لوگوں میں ایمان اب بھی باقی ہے۔ وہ اپنے اسلاف کی روایات کو زندہ وبرقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے وہ کسی بھی مشکل سے ٹکرا جاتے ہیں۔ جب سیاست دان ایسے بہادروں کو روایات کے خلاف کچھ کرنے کا کہتے ہیں تو وہ غلط کام کرنے سے انکار کردیتے ہیں۔ ایسے بہادر لیڈروں کو غلط کام کرنے سے روکنے کی جرات بھی کرلیتے ہیں جن کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ ان لوگوں سے کھلم کھلا دشمنی مول لے لیتے ہیں۔ سیاسی لیڈر اپنی انا میں ان بہادروں کو یا تو قتل کروادیتے ہیں یا پھر انہیں کسی ایسی مشکل میں پھنسادیتے ہیں جس سے نکلنا ان کے لیے مشکل ہو۔ سیّد انصر ان بہادروں کی بہادر گوئی یوں بیان کرتے ہیں:

ترک حق گوئی کی ترغیب نہ دے اے دشمن
ہم نہیں بیچتے اسلاف کی دستاروں کو(71)

یہ سیاستدان جاگیردارانہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جو ہر وقت عوام کو دبانے کے چکر میں لگے رہتے ہیں۔ ان پر جبر واستحصال اپنا حق سمجھتے ہیں۔ لیکن غیرت مند بہادر لوگ اپنے آباؤاجداد کی بنائی ہوئی روایتوں کو برقرار رکھتے ہوئے ان باطل قوتوں سے ٹکرا جاتے ہیں۔

اس باب میں سیّد انصر کے شعری مجموعہ "دسترس" کے فکری موضوعات کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ ان کی شاعری کی پہلی تخلیق ہے جو 2000ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ 75 غزلیات پر مشتمل ہے۔ ان کا طبعی میلان غزل کی طرف ہے اس لیے ان کا یہ شعری مجموعہ چند ایک نظموں کے علاوہ مجموعی طور پر غزلیات پر مشتمل ہے۔ ان کی غزلوں میں سلاست و روانی پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری میں انسان اور انسانیت سے محبت، درد و الم اور چاہت و الفت کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں حقیقت پسندی کا عنصر بہت واضح اور نمایاں نظر آتا ہے۔

انہوں نے اپنے شعری مجموعہ "دسترس" میں زندگی کے واقعات اور معاملات کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ حقیقی زندگی میں معاشرتی مسائل اور اتار چڑھاؤ کی منظر کشی واضح ہوتی ہے۔ ان کی شاعری معیشت و معاشرت اور تہذیب و اخلاق کے بیشتر پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ جن میں عشق و محبت کے جذبوں کی صداقت اور آفاقیت پر یقین، ماضی کی پختہ روایات کا لحاظ، مستقبل کی تابناکیوں پر اعتماد، وطن سے محبت اور اس کے ناموس و وقار کا گہرا احساس، انسان اور انسانیت کی قدروں سے دوستی اور ان کا احترام، غلط رسوم و روایات کے بارے میں مخالفت و مزاحمت کا چلن، جعلی و نمائشی لبادہ پوشی اور جھوٹی پارسائی سے نفرت وغیرہ شامل ہے۔ ان کی شاعری پڑھتے ہوئے سامعین اور قارئین پر ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ ان کے جذبات کی ترجمانی کر رہی ہے۔ انہوں نے اپنی اس کتاب میں آہ سے لے کر واہ تک کا سفر بہت خوبصورت انداز میں کیا ہے اور اپنے حسن فکر کو الفاظ کے ساتھ اس انداز میں پیش کیا ہے کہ شاعری میں ترنم کا انداز ملتا ہے۔

ان کی شاعری درد و غم اور پاکیزہ عشق و محبت جیسے جذبے سے سرشار ہے۔ وہ دوسروں کے وسیلے پر انحصار کرنے کی بجائے خود انحصاری کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ دولت و حسن کی حرص و ہوس سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں۔ ان کی فکر زندگی کے بارے میں ان کی سوچ کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ عوام کے دکھ کو اپنا دکھ محسوس کرتے ہوئے اسے شاعری کے موتیوں میں پروتے ہیں۔ غریبوں اور مظلوموں کے دکھوں پر وہ درد محسوس کرتے ہوئے غیروں کی منت کشی اور پیروی کے برخلاف عزت نفس کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ قومی و تہذیبی سطح سے بالاتر ہو کر مساوات اور بھائی چارے کو فروغ دیتے ہیں۔ حریفوں اور مخالفین کی دشمنیوں کے باوجود ان میں اپنے ہونے اور بھرپور زندہ توانائی سے جینے کا احساس ملتا ہے۔

ان کی شاعری میں مشکلات کے باوجود رجائیت کی لہر بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ رجائی لہجہ اختیار کرتے ہوئے خدا پر کامل یقین رکھتے ہیں اور اپنی شاعری میں منفی سوچوں کو راہ نہیں دیتے۔ وہ اپنے افکار کو اس طرح بھرپور معنوی رنگ دیتے ہیں کہ ان کا پیغام ان کی شعری صداقت کا مظہر بن جاتا ہے۔ انہوں نے اس شعری مجموعہ "دسترس" میں مختلف موضوعات کو شاعرانہ رنگ دیا ہے۔ ان موضوعات میں تصوف، حسن و عشق، غم، امید، درد و الم، ہجر و فراق، یادیں، زندگی، بے وفائی، موت، منافقت، خواب و خیال، دہشت گردی، غربت، حب الوطنی، ہوس اور سیاست جیسے موضوعات شامل ہیں جو کہ معاشرے کی مکمل عکاسی کرتے ہیں۔

حوالہ جات

1 ممتاز الحق،ڈاکٹر،اردو غزل کی روایت اور ترقی پسند غزل،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی،1997ء، ص:38

2 عبد القادر غیاث الدین صدیقی، ڈاک ٹر،اردو شاعری اور تصوف تاریخی و تنقیدی جائزہ،مطبعہ ابو الوفاالافغانی جامعہ، حیدرآباد، 2009ء،ص:3

3 سیّد انصر،انٹرویو،سرائے عالمگیر، گجرات،19 مارچ 2022ء،وقت دن12:15

4 سیّد انصر، دسترس، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، 2000ء، ص:17

5 اَیضًا،ص:18

6 ایضا،ص:122

7 یوسف حسین خاں،ڈاکٹر،اردو غزل،اعظم اسٹیم پریس،حیدرآباد دکن، طبعِ اول، 1948ء، ص:288

8 سیّد انصر، دسترس،ص:59

9 ایضا،ص:49

10 ایضا،ص:109

11 ایضا، ص:54

12 ایضا،ص:39

13 ایضا، ص:30

14 ایضا،ص:80

15 فراق گورکھپوری، من آنم،ادارہ فروغ اردو،لاہور،1862ء،ص:55

16 یوسف حسین خاں، ڈاکٹر،اردو غزل،اعظم اسٹیم پریس،حیدرآباد دکن،1948ء،ص:30

17 سیّد انصر،دسترس،ص:109

18 ممتاز بنگلوری،مرتب، طیف غزل، لیکچر از ڈاکٹر سید عبداللہ، لاہور اکیڈمی، لاہور، 1948ء، ص:54

19 سیّد انصر، دسترس، ص:89
20 ایضاً، ص:41
21 ایضاً، ص:44
22 ایضاً، ص:99
23 ایضاً، ص:51
24 ایضاً، ص:27
25 ایضاً، ص:49
26 رفیع الدین ہاشمی، اصناف ادب، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، 2001ء، ص:32
27 سیّد انصر، دسترس، ص:120
28 زبیر رضوی، نئی نظم تجزیہ اور انتخاب، جی کے آف سیٹ، جامع مسجد، دہلی، 2007ء، ص:52
29 سیّد انصر، دسترس، ص:45
30 اَیضًا، ص:76
31 احمد حسین مجاہد، رموز شعر، نیسٹ پریس، اسلام آباد، 2017ء، ص:73
32 سیّد انصر، دسترس، ص:28
33 ایضاً، ص:80
34 ایضاً، ص:60
35 ایضاً، ص:111
36 ایضاً، ص:87
37 ایضاً، ص:25
38 ایضاً، ص:69
39 ایضاً، ص:120
40 القرآن، آل عمران 3، آیت:185
41 سیّد انصر، دسترس، ص:23
42 القرآن، الرحمن 55، آیت:27-26

43 سیّد انصر، دسترس، ص:85

44 ایضا، ص:52

45 ایضا، ص:104

46 القرآن ،البقرہ 2، آیت:154

47 سیّد انصر، دسترس، ص:82

48 محمد عبدالستار، مقالہ، احمد ساقی بطور شاعر، شعبہ اردو، لیڈز یونیورسٹی، لاہور، 2020ء، ص:62

49 سیّد انصر، دسترس، ص:55

50 ایضا، ص:60

51 سیماب اکبر آبادی، دستور اصلاح، مکتبہ قیصر الادب، آگرہ، 1944ء، ص:14

52 سیّد انصر، دسترس، ص:63

53 ایضا، ص:53

54 ایضا، ص:76

55 ایضا، ص:112

56 ایضا، ص:121

57 ایضا، ص:86

58 ایضا، ص:21

59 ایضا، ص:86

60 HTTPS://FORUM.MOHADDIS.COM>THREADS

61 سیّد انصر، دسترس، ص:127

62 ایضاً، ص:127

63 ایضا، ص:105

64 ایضا، ص:25

65 ایضا، ص:123

66 ایضا، ص:72

67 ایضا،ص:127

68 ایضا،ص:111

69 ایضا،ص:123

70 ایضاً، ص:98

71 ایضاً، ص:117

باب چہارم

سیّد انصر کی غزلوں کا فکری جائزہ "برسوں بعد" کے تناظر میں

کسی بھی بات کو مختصراً چند الفاظ میں بیان کرنا شعر کہلاتا ہے۔ جو بات یا جذبات کسی کے سامنے بیان کرتے ہوئے انسان ہچکچاتا ہے وہی جذبات و احساسات شعری قالب میں ڈھال کر بیان کرنا اظہار کو آسان بنا دیتا ہے۔ الفاظ کو وزن کے ساتھ بیان کرنا شعر کہلاتا ہے۔ ایک شعر میں دو مصرعے ہوتے ہیں۔ ہر سطر ایک مصرع کہلاتی ہے اور دو مصرعے مل کر مکمل شعر بناتے ہیں۔

سیّد انصر کے نزدیک شعر وہ ہے جس کا تعلق انسانی زندگی سے ہو۔ یعنی اس کا تعلق کسی بھی طرح انسانی زندگی سے ضرور پایا جاتا ہو۔ چاہے وہ زندگی کے کسی بھی پہلو سے متعلق ہو۔ وہ ادب برائے زندگی کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک شعر برائے شعر وقت کا ضیاع ہے۔ بغیر مقصد کے شعر کہنا وقت ضائع کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہر وہ چیز جو ہمارے مشاہدے میں ہو اور تہذیب کے دائرے میں رہ کر کہی جائے تو اس کو شعر میں لانا ضروری ہے۔ شاعری تہذیب کے دائرے میں رہ کر کرنی چاہیے۔ ہر اس خیال کو شعری پیکر میں ڈھالنا چاہیے جس بات کی اجازت ہمارا مذہب اور تہذیب دیتی ہے۔ اس طرح ہر قسم کے موضوعات کو شاعری کا حصہ بنایا جا سکتا ہے۔

شعر کا مطلب جاننا پہچاننا اور کسی چیز کی واقفیت حاصل کرنا ہے۔ شعر اس موزوں کلام کو کہا جاتا ہے جو قصداً کہا جائے۔ یہ کلام جذبات و احساسات کے تابع ہوتا ہے۔ کسی واقعہ کے بارے میں جو ہمارے احساسات ہوتے ہیں ان کو رمز و غنائیت سے بیان کرنا شعر کہلاتا ہے۔ اپنے جذبات و احساسات، اقدار و روایات، مدح و ذم اور حالات و واقعات کو شاعری میں غیر معمولی انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ اس میں تخیل و محاکات کا بڑا عمل دخل ہے۔ جمع شدہ معلومات سے کوئی خیال لینا تخیل اور پھر اسے خوبصورت الفاظ کے ذریعے پیش کرنا محاکات کہلاتا ہے۔ قوت متخیلہ جس قدر مضبوط ہوگی شاعری اتنی ہی اعلیٰ درجے کی ہوگی۔ اسی طرح شاعری میں وزن کا ہونا بہت ضروری ہے۔ دو کلموں کی حرکات و سکنات کے برابر ہونے کو وزن کہا جاتا ہے۔ اگر کسی مضمون کو کسی بھی خوبصورت انداز میں پیش کر دیا جائے لیکن اس میں وزن اور آہنگ نہ ہو تو یہ شعر نہیں بلکہ نثر کہلائے گی۔

بیسویں صدی کے آغاز تک اردو شاعری کا جو تصور تھا اس میں غزل کا مطلب محبوب سے باتیں کرنا، ہرن کی درد بھری آواز اور عورتوں کی باتیں کرنا تھا۔ اس دوران نئے آنے والے شعرا نے اس شعری تصور کو ختم کرنے کی کوشش کی اور جدید شاعری کا تصور پیش کیا۔ ان شعرا میں میر تقی میر، ولی دکنی، مومن خان مومن، ذوق، انشا، مرزا رفیع سودا، خان آرزو وغیرہ شامل ہیں۔ مرزا رفیع سودا کو ہمارے نقاد غزل میں اگرچہ اتنی اہمیت نہیں دیتے لیکن ان کی غزل میں بہت جدید خیالات ملتے ہیں جو پرانے تصور شاعری سے ہٹ کر تھے۔ حسرت اور جگر مراد آبادی وغیرہ غزل کے اسی روایتی تصور پر قائم رہے۔ بنیادی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ جدید شاعری کی بنیاد مرزا غالب نے ڈالی کیونکہ انہوں نے شاعری کو نئے قالب میں ڈھالا اور اس میں نئے موضوعات شامل کیے۔ ان جیسی اعلی پائے کی شاعری آج تک کوئی نہیں کر سکا۔ اس کے بعد علامہ اقبال نے جدیدیت کو انتہا تک پہنچا دیا۔ انہوں نے تصوف اور خودی جیسے فکری عناصر کو ایک اعلی اور الگ رنگ دیا۔

اس طرح شاعری میں جدت پیدا ہوئی اور زندگی کے ہر شعبے اور مسئلے کو شعر کی صورت میں بیان کیا جانے لگا۔ اس طرح اگر کسی مسئلے میں شعریت ہو تو وہ شعر کہلائے گا لیکن اگر ان الفاظ میں وزن اور بحر کے ساتھ شعریت پیدا نہ ہو تو وہ صرف ایک خبر ہو گی شعر نہیں ہو گا۔ غزل کے ہر شعر میں الگ مضمون ہوتا ہے۔ دائرۃ المعارف میں شعر کی تعریف یوں بیان کی گئی ہے:

> "مقررہ وزن اور بحر میں لکھی ہوئی تحریر شعر کہلاتی ہے۔ شعر کی جمع کو اشعار کہتے ہیں۔ شعر کی سطر مصرع کہلاتی ہے۔ ایک شعر میں دو مصرعے ہوتے ہیں۔"(1)

کسی بھی فن پارے میں فکر کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ شروع میں انسانی ذہن میں فکر کی لہر ابھرتی ہے۔ تخلیق کار اس کو الفاظ کا جامہ پہناتا ہے اور یوں اظہار ممکن ہوتا ہے۔ کسی بھی شاعر کے موضوعات اس کی شاعری کی پہچان ہوتے ہیں۔ ان موضوعات سے اس شاعر کی فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ سیّد انصر بھی شاعری میں اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں ان کا فکری میلان زیادہ تر معاشرے میں پائے جانے والے عناصر کی طرف ہے۔

سیّد انصر کا شعری مجموعہ "برسوں بعد" پہلے مجموعہ کے چھ سال بعد 2006ء میں ارباب ادب پبلی کیشنز کی طرف سے منظر عام پر آیا جسے عوام میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کا یہ شعری مجموعہ مختلف فکری افکار پر مشتمل ہے۔ ان کا نام بھی آج کے ان ترقی پسند شعرا میں شامل ہے جنہوں نے ہر موضوع کو اپنی شاعری میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی شاعری بھی عشق و محبت جیسے موضوع سے شروع ہوئی لیکن بعد میں اس میں نئے موضوعات شامل ہوتے گئے۔

ان کی ابتدائی شاعری میں حسن و عشق، محبت، جدائی اور غم جیسے موضوعات ملتے ہیں لیکن بعد میں اس شاعری میں وسعت پیدا ہوئی اور ان کی شاعری نے انفرادیت سے نکل کر اجتماعیت کا رنگ اختیار کر لیا۔ انہوں نے دنیا کو قریب سے دیکھنا شروع کیا جس میں انہیں بہت سی سچائیاں نظر آنا شروع ہوئیں جنہیں بدلنا ناممکنات میں سے تھا۔ انہوں نے اس تخیل کو شعری سانچے میں ڈھال دیا۔ ان کی شاعری میں مکہ و مدینہ، بدر و حنین اور نجف و کربلا کے واقعات ملتے ہیں۔ یہ تصوف کے گرد گھومتی ہوئی نیک و بد، حق و باطل، دنیاوی حقیقتوں، معاشرتی گراوٹ اور وطن پاکستان کی سلامتی کے لیے لوگوں میں امن و امان قائم رکھنے کی تلقین کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان کی غزل تصوف، عشق، محبت، وطن پرستی، امرا کی غفلت، شکوہ، رازداری، غریبوں کا استحصال، خدا کی وحدانیت، معاشرتی خوف جیسے فکری عناصر پر مشتمل ہے۔

وحدانیت:

سیّد انصر وحدانیت کے سچے دل سے قائل ہیں۔ وہ اپنے دل میں حقیقی مومنانہ جذبات رکھتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری میں وحدانیت کا اظہار مختلف انداز سے کرتے ہیں۔ وحدانیت کا مطلب ہے یکتا، اکیلا، واحد اور خدا کا ایک ہونا یعنی خدا ایک ہے۔ وہ یکتا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ وہ اکیلا ارض و سما کا مالک ہے۔ دنیا کی ہر چیز اسی کے اختیار میں ہے۔ وہ جزا و سزا کا اکیلا مالک ہے اور وہ دونوں جہانوں کا مالک ہے۔ انسان کا جینا مرنا سب خدا کے ہاتھ میں ہے۔ کائنات کے ذرے ذرے میں اسی کا ظہور ہے۔ وہ انسان کو دیکھ سکتا ہے لیکن انسان اسے نہیں دیکھ سکتا۔ خدائے واحد کی ذات مالک کل ہے۔ وہ بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔

انسان کی زبان سے خدا کی مکمل تعریف ممکن نہیں۔ انسان کی سانس سے لے کر ہر چیز کا اختیار خدا کے ہاتھ میں ہے۔ مسلمان ہونے کے ناطے اس کی یکتائی کا دعویٰ کرنا ایمان کامل کی نشانی ہے۔ خدا اپنی ذات اور صفات میں اکیلا ہے۔ خدا کی ذات ساری طاقتوں کی مالک ہے۔ اس کے حکم کے بغیر ایک پتا بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ کوئی مکھی اس کے حکم کے بغیر پر نہیں ہلا سکتی۔ وہ خدائے واحد تمام جہانوں کا مالک ہے۔ ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں کا مالک ہے۔ خدا ساری مخلوق کا رازق ہے۔ وہ پتھر میں بھی کیڑے کو رزق پہنچا سکتا ہے۔ اس کو ہر کام میں اکیلا مالک ماننا وحدانیت پر ایمان لانا ہے۔

سیّد انصر کا گھرانہ مکمّل طور پر مذہبی ہے۔ خاندانی سادات ہونے کی وجہ سے ان کو دین سے خصوصی لگاؤ ہے۔ وہ خدا کی وحدانیت پر مکمل یقین رکھتے ہیں اور اس کے فیصلوں پر یقین کامل رکھتے ہیں۔ جو کام انسان

کے بس میں نہیں وہ اپنی مرضی سے ایک لمحے میں کر دیتا ہے۔ ناممکن کو ممکن بنانا بھی خدا کا کام ہے۔ وہ خدا کی خدائی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مجھ سے جو کام نہیں ہو سکتے
میرا لجپال کیے جاتا ہے(2)

اللہ ہر مشکل میں اپنے بندوں کی مدد کرتا ہے۔ دشمن کے مقابلے میں اپنے بندوں کو فتح عطا کرتا ہے۔ اسی خدا نے جنگ بدر میں کفار کے مقابلے میں مسلمانوں کی تھوڑی سی تعداد کو فتح نصیب کی اور انہیں کامیابی و کامرانی سے نوازا۔ خدا نے مسلمانوں کو دنیا میں عزت عطا کی۔ خدا کے ماننے والے ہمیشہ کامیاب و کامران رہتے ہیں۔ اللہ کے بندوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اللہ کے آگے عاجزی اور انکساری سے جھکے رہیں۔ ہمیشہ اللہ کا شکر ادا کریں۔ وہ خدا غفور الرحیم ہے۔ ہم انسانوں کے گناہ اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ اگر خدا ان تمام گناہوں پر دنیا میں ہی سزا دے دیں تو ہم اس کی پکڑ سے بچ نہ پائیں لیکن خدا کی ذات بہت با پردہ ہے۔ وہ ہمارے گناہوں پر پردہ ڈال کر ہمیں دنیا میں عزت عطا کرتی ہے۔ انسان سے جتنی خطائیں سرزد ہو جاتی ہیں اگر وہ سب انسانوں پر واضح ہو جائیں تو سب ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگیں گے۔ وہ خدا ہی ہے جو انسان کی نادانیوں پر پردہ ڈال کر اسے معاشرے میں عزت عطا کرتا ہے۔ سیّد انصر عاجزی و انکساری سے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

تیرے دم سے ہوں معتبر ورنہ
شہر میں آبرو کیا ہے مری(3)

خدا کو عاجزی و انکساری بے حد پسند ہے اور یہ وہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے انسان خدا کی قربت تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ غرور خدا کو سخت ناپسند ہے۔ عاجزی اختیار کرنے سے انسان کو عزت و سربلندی ملتی ہے۔ خدا کے آگے جھکنا انسان کے نفس کو مار دیتا ہے۔ دل خدا کی محبت سے بھر جاتا ہے۔ تمام دنیا کی بادشاہی اسی کے اختیار میں ہے۔ اس نے پہاڑوں، جنگلوں، بیابانوں، گلستانوں، دریاؤں، ندی نالوں، پرندوں اور جانوروں کو اپنے اختیار میں رکھا ہوا ہے۔ وہ سب اسی مالک کل کی پیروی کرنے والے ہیں۔ خدا جسے چاہے عزت دے جسے چاہے ذلت دے۔ سب کچھ خدا کے اختیار میں ہے۔ خدا اپنے بندوں کو کبھی اکیلا نہیں چھوڑتا۔

اتباعِ رسول:

اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مراد ہے نبی پاک صلی وسلم کی پیروی کرنا۔ کلمہ توحید میں اللہ تعالی کے بعد نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر ہے۔ یعنی کوئی بھی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا ہے جب تک وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ کا آخری نبی نہ مانے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی تمام جہانوں کے لئے نمونہ ہے۔ اللہ تعالی نے اپنی محبت کو نبی پاک کی پیروی کے تابع کر دیا ہے۔ اس محبت میں احتیاط لازم ہے کچھ لوگ نعت گوئی میں اختراع سے کام لیتے ہوئے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا سے ملا دیتے ہیں۔ اس بارے میں ڈاکٹر ریاض مجید لکھتے ہیں:

> "حضور اکرمؐ کی محبت کے اظہار میں اگر ہوش، بصیرت سے کام نہ لیا جائے تو ہر قدم پر لغزش کا امکان ہے۔ کیونکہ آپؐ کے ادب واحترام اور شان اقدس میں ذرا سی بے احتیاطی اور ادنیٰ سی لغزش نعت نگار کے خیالات اور الفاظ کو تو کیا ایمان اور اعمال تک کو غارت کر دیتی ہے۔"(4)

اس سے واضح ہے کہ اللہ کی محبت حاصل کرنے کے لیے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کرنا لازمی ہے۔ اتباع رسول کی پیروی کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے اعمال کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے مطابق کیا جائے۔ جس کام کا نبی پاک صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے حکم دیا ہے وہ کیا جائے اور جس سے منع کیا ہے اس کام سے رک جائیں۔ حضور ﷺ کی محبت ہر شے سے بالاتر ہونی چاہیے جو ہمارے ایمان کا تقاضا ہے۔ نعت گوئی ہر شاعر کے کلام کا حصہ رہی ہے۔ ہر مسلمان شاعر اپنی شاعری کا آغاز نعت گوئی سے کرتا ہے۔ اردو میں نعت گوئی کی روایت بڑی مستحکم ہے۔ اردو میں نعت گوئی کی روایت فارسی سے آئی۔ اردو کے ابتدائی شعرا میں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، قلی قطب شاہ، ولی دکنی اور میر تقی میر شامل ہیں جبکہ بعد کے نعت گو شعرا میں امیر مینائی، اکبر آلہ آبادی، حفیظ تائب، ڈاکٹر ریاض مجید اور صبیح رحمانی کے نام شامل ہیں۔ اس طرح نعت گوئی بھی شاعری کے موضوعات میں شامل ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس ضمن میں رقمطراز ہیں:

> "جہاں تک موضوع کی وسعت کا تعلق ہے اس میں آنحضرت ﷺ کی زندگی اور سیرت کے توسط سے انسانی زندگی کے سارے ثقافتی و تہذیبی پہلو اور سماجی و سیاسی مباحث در آتے ہیں۔"(5)

سیّد انصر نے بھی نعت گوئی کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کی ابتدا حمد و نعت سے کی ہے۔ وہ شروع سے ہی صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں۔ ان میں نیکی کی ترویج کا بہت جذبہ پایا جاتا ہے۔ انہیں اللہ اور اس کے رسول کی محبت حاصل ہے۔ ان کا یہ دعویٰ ہے کہ جس دل میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت ہو گی پریشانیاں اور مصیبتیں اس انسان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ کچھ مصیبتیں انسان کے گناہوں کی وجہ سے اس پر آتی ہیں اور کچھ پریشانیاں اور مصیبتیں انسان پر آزمائش کی صورت میں آتی ہیں لیکن جب اللہ اور اس کے رسول کی محبت حاصل ہو تو اللہ تعالیٰ ان پریشانیوں سے نپٹنے کا حوصلہ بھی عطا کرتا ہے۔ سیّد انصر اللہ اور اس کے رسول کی محبت میں لکھتے ہیں:

کیوں مجھ کو ستائیں گی زمانے کی بلائیں
اللہ میرے دائیں ہے محمد میرے بائیں(6)

عاشقان رسول ﷺ کے دل نبی پاک ﷺ کی محبت میں سرشار ہوتے ہیں اور ان کا دل ہمیشہ نبی ﷺ کی محبت سے بھرا ہوتا ہے۔ جس کی بنا پر وہ اپنے اعمال سنت کے مطابق کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ وہ جو بھی کام کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی رضا کے لئے کرتے ہیں۔ وہ لوگوں کے لئے آسانیاں پیدا کرتے ہیں اور ان کی مشکلات دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اللہ تعالی بھی ایسے شخص پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل کرتے ہیں اور اسے دنیا و آخرت کی کامیابی سے نوازتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"ترجمہ: اس وقت تک کوئی تم میں سے مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کی اولاد، والدین بلکہ تمام جہان کے انسانوں سے بڑھ کر محبوب نہ ہو جاؤں۔"(7)

نبی پاک ﷺ سراپا حُسن و جمال ہیں۔ اللہ تعالی نے آپ ﷺ جیسا نہ کوئی بنایا ہے اور نہ ہی بنائے گا۔ آپ ﷺ سب سے اعلیٰ و ارفع، سب سے اجمل، سب سے اکمل اور سب سے انور ہیں۔ تمام کمالات مل کر بھی نبی پاک ﷺ کی شان بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو معجزات عطا کیے۔ انگلی کے اشارے سے چاند کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کرنا نبی پاک کا معجزہ ہے۔ آپؐ خوبصورتی کا مرقع ہیں۔ آپ حسین و جمیل اور اعلی و ارفع ہیں۔ سیّد انصر نبی پاک ﷺ کی تعریف میں لکھتے ہیں:

چہرہ ہے کہ اک نور ، جو دیکھا نہ سنا ہو
زلفیں ہیں کہ چھائی ہوئی رحمت کی گھٹائیں(8)

نبی پاک ﷺ کی زندگی تمام انسانوں کے لیے بہترین نمونہ ہے۔ کوئی حاکم ہو یا محکوم، جرنیل ہو یا سپہ سالار، عالم ہو یا معلم، استاد ہو یا شاگرد، ڈاکٹر ہو یا انجینئر، سیاسی لیڈر ہو یا عام آدمی غرض کوئی بھی انسان کسی بھی پیشے سے تعلق رکھتا ہو وہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔ عاشق رسول نبی ﷺ کے اعمال، احکامات اور ان کے نظریات سے محبت کرتے ہیں۔ ہمیشہ حق کا ساتھ دیتے ہیں۔ وہ نبی ﷺ کی ہر چیز سے محبت کرتے ہیں۔ چاہے وہ آپ ﷺ کا شہر ہو، آپ صلی اللہ وسلم کی گلیاں ہوں، آپ ﷺ کا محلہ ہو یا آپ ﷺ کے ساتھی ہوں، وہ ہر اس چیز کو محبوب رکھتے ہیں جس کو نبی پاک ﷺ نے دیکھا ہو، چھوا ہو یا اس کے ساتھ وقت گزارا ہو۔ نبی ﷺ سے ایسا عشق کرنے والے کبھی بھی خالی ہاتھ نہیں لوٹتے۔ ان کے دل میں موجود محبت انہیں نبی کے در پر لے جاتی ہے۔ سیّد انصر عاشق رسول ﷺ کے بارے میں لکھتے ہیں:

خالی کوئی منکر ہی پلٹتا ہے وہاں سے
عشاق پہ ہوتی ہیں عطائیں ہی عطائیں(9)

نبی پاک ﷺ کی محبت جس کو حاصل ہو جائے اسے خدا کی محبت حاصل ہو جاتی ہے۔ اسوہ حسنہ پر عمل پیرا ہو کر سب لوگ کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ آپؐ کو تمام جہانوں کے لیے باعث رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔ آپؐ کی تعلیمات تمام انسانوں کے لیے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر دنیا اور آخرت کو سنوارا جا سکتا ہے۔

امامؑ کربلا پر سلام:

واقعہ کربلا جو 10 محرم 61 ہجری کو عراق میں کربلا کے مقام پر پیش آیا۔ جس میں اموی خلیفہ یزید اول کی بھیجی گئی فوج نے نواسہ رسول حضرت امام حسینؑ بن علی کو شہید کر دیا۔ کیونکہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے حق کا راستہ اپناتے ہوئے یزید کے بنائے ہوئے ان اصولوں کو ماننے سے انکار کر دیا جو اسلام کے منافی تھے۔ جس بنا پر ملعون یزید نے امام حسین رضی اللہ تعالی عنہ کو بچوں سمیت کربلا کے مقام پر شہید کر دیا۔

کربلا کے میدان میں پیش آنے والے اس عظیم واقعے کو جہاں دیگر طبقات، گروہوں، سخن وروں، دانشوروں اور ادیبوں نے اپنا موضوع بنایا۔ وہاں اردو ادب کے شعرا نے بھی اسے اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔ مختلف شعرا نے اس موضوع پر مرثیے، نوحے، غزلیں، نظمیں اور سلام و سرور لکھا۔ سیّد انصر چونکہ سادات

خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ان کی عقیدت و احترام بھی فطری بات ہے۔ ان کی شاعری میں بھی مختلف جگہوں پر کربلا کے استعارے ملتے ہیں۔ انہوں نے امام کربلا سے عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے انہیں سلام پیش کیاہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ سر یہ نوک سناں پر کلام، لاکھوں سلام
سلام، اہل وفا کے امام، لاکھوں سلام
یہ آب جو نہیں دونوں جہان تیرے ہیں
لب فرات کھڑے تشنہ گام، لاکھوں سلام
قدم قدم پہ ہواؤں کو شرمسار کیا
نبی کے گھر چراغوں سلام، لاکھوں سلام(10)

سیّد انصر نے اپنی شاعری میں کربلا کے شہیدوں کی بہادری کا ذکر کیاہے کہ جس دلیری سے انہوں نے اپنے نانا کے اسلام کی سربلندی کے لیے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے۔ وہ دریائے فرات کے کنارے تشنہ لب اسلام کی سربلندی کے لیے سر کٹاتے گئے۔ میدان جنگ میں کوئی بھی شہسوار وہ رتبہ حاصل نہیں کر سکتا جو امام حسین کو ملا۔ کربلا جیسی جنگ تاریخ میں اور کہیں نہیں ملتی۔ سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خاندان نے بھوکے پیاسے جس طرح اسلام کے وقار کے لیے جام شہادت نوش فرمایاوہ باعث فخر ہے۔ ان کے خاندان کی شہادت رہتی دنیا تک یاد رہے گی۔ سیّد انصر امام حسین کی کرامت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حسینیت کی کرامت کا ظہور کہاں
کہ جب تلک کوئی جنگاہ کربلا نہ بنے(11)

میدان کربلا میں نواسہ رسول حضرت امام حسین رضی اللہ تعالی عنہ نے جو قربانی پیش کی اس کی یاد تا قیامت تازہ رہے گی۔ حضرت امام حسین اور ان کے خاندان کی اسلام کے لئے دی گئی قربانی مومنوں کے ایمان کو تازہ کرتی ہے۔ یہ غم تمام اہل ایمان کو غمزدہ کر دیتاہے چاہے اس کا تعلق کسی بھی فرقے سے ہو۔ اہل تشیع، اہلحدیث، حنفی، بریلوی سب یزید کے اس عمل پر اسے ملعون ٹھہراتے ہیں جس نے ننھے بلکتے بچوں کو پانی پینے سے بھی محروم کر دیا۔ امام حسین کی اسلام کے لیے دی گئی یہ قربانی تمام مسلمانوں کے لیے معرکہ حق کی

سربلندی ہے۔ حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قربانی سے اسلام کو نئی زندگی ملی۔ اس میں باطل کو شکست اور حق کو فتح نصیب ہوئی۔

تصورِ جبر و قدر:

جبر و قدر کا مطلب ہے کہ کوئی انسان اپنی قسمت کے ہاتھوں مجبور ہے یا اپنی مرضی کا مالک اور خود مختار ہے۔ اس دنیا میں اسے مختار کل بنا کر بھیجا گیا ہے یا اس کی ڈور کسی اور کے ہاتھوں میں تھما دی گئی ہے۔ فلاسفروں میں جبر و قدر کے اس نظریے کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک گروہ کے نزدیک انسان کے اعمال لوح محفوظ میں لکھ دیے گئے ہیں۔ اس لئے انسان جو بھی کام کرتا ہے چاہے وہ اچھے ہوں یا برے، وہ پہلے سے لکھے ہوئے ہیں۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ دوسرے گروہ کے مطابق انسان اپنی مرضی کا مالک یا خود مختار ہے۔ وہ خود اپنی مرضی سے اپنے اعمال کو بدل سکتا ہے جبکہ تیسرا گروہ وہ ہے جو کہتا ہے نہ تو انسان مختار کل ہے اور نہ ہی مجبور محض بلکہ وہ دونوں صورتوں کے درمیان میں ہے۔

قدر کا مطلب ہے تقدیر پر ایمان رکھنا۔ اسلام میں عقیدہ بالقدر پایا جاتا ہے کہ بنی نوع انسان کے اعمال اللہ تعالیٰ نے لوح محفوظ میں لکھ دیے ہیں۔ قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اور ہر چیز کو ہم نے روشن کتاب (لوح محفوظ) میں احاطہ کر رکھا ہے۔"(12)

یعنی انسان کے اعمال، اس کی زندگی اور موت سب کچھ ازل سے لکھ دیا گیا ہے۔ انسان کے افعال و اعمال لکھنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے انسان کو اختیارات دیے کہ وہ بدی اور نیکی میں سے جس راستے کا چاہے انتخاب کر سکتا ہے۔ نیک اعمال اسے جنت میں لے جائیں گے اور برے اعمال اسے جہنم میں لے جانے کا سبب بنتے ہیں۔ انسان کا رزق اس کے مقدر میں لکھ دیا گیا ہے اس لیے اسے حاصل کرنے کے لیے اچھائی کا راستہ اختیار کرے نہ کہ برائی کی طرف گامزن ہو جائے اور اپنی دنیا اور آخرت کو برباد کر لے۔ انسان کا مقدر لکھنے کے ساتھ ساتھ اسے نیکی اور بدی کا اختیار بھی دیا گیا ہے۔ نبی پاک صلی وسلم نے بھی جبر و قدر کی تعریف کرتے ہوئے حدیث میں فرمایا:

> "اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال قبل تمام مخلوقات کی تقدیریں لکھ دی تھیں۔ یہ تب کی بات ہے جب اس کی حکمرانی پانی پر تھی۔"(13)

علامہ اقبال کے تصورِ خودی میں بھی جبر و قدر کا تصور ملتا ہے۔ علامہ اقبال کے تصور جبر و قدر کے مطابق نہ تو انسان مکمل طور پر آزاد پیدا کیا گیا ہے اور نہ ہی مکمل طور پر پابند ہے۔ اللہ تعالی نے جزاو سزا کو واضح کرتے ہوئے انسان کو اچھے یا برے اعمال کرنے کا اختیار دیا ہے۔ جبر و قدر کے حوالے سے ہر انسان کا اپنا تصور ہے اور ہر کوئی اپنے نظریات رکھتا ہے۔ پروفیسر سیّد صفی حیدر دانش اس ضمن میں رقمطراز ہیں:

> "جبر و قدر کا مسئلہ صرف اہلِ اسلام ہی سے تعلق نہیں رکھتا، بلکہ تمام دنیا والوں کے دماغوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ ایک طرف انسان کی محیر العقول اور سنسنی خیز ترقیاں، عجیب و غریب ایجادات، غیر معمولی ذہنی و جسمانی قوتوں کے مظاہرے، اس کے فاعل مختار ہونے کا خیال پیدا کر دیتے ہیں۔ دوسری طرف اس کے عبرت ناک ناکامیوں سے مجبور مطلق ہونے کا تصور پیدا کرتا ہے۔"(14)

سیّد انصر کی غزل میں بھی جبر و قدر کا تصور پایا جاتا ہے۔ ان کی شاعری کو پڑھتے ہوئے ان کے نظریہ جبر و قدر کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ وہ نظریہ جبر کے قائل ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہر وہ چیز جو خدا نے بنائی ہے اس کا ہر فعل اللہ تعالی نے لوح محفوظ میں لکھ دیا ہے۔ جس میں تبدیلی ممکن نہیں۔ مقدر کا لکھا دعاؤں سے تھوڑا بہت تبدیل کیا جا سکتا ہے لیکن مقدر کے ہاتھوں انسان بے بس اور مجبور ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انسان کسی کام کے لیے بہت زیادہ محنت کرنے کے باوجود ناکام ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ چیز اس کے مقدر میں نہیں لکھی گئی تھی۔ سیّد انصر اس کو اپنی شاعری میں یوں بیان کرتے ہیں:

> لوح محفوظ پر لکھا ہے میری لو کا دوام
> خود ہوا بھی مرے جلنے کی دعا کرتی ہے(15)

کچھ عرصہ قبل سیّد انصر نظریہ قدر کے قائل تھے کہ انسان کوشش کرنے سے مقدر کو بدل سکتا ہے لیکن بعد میں ان کے نظریہ میں تبدیلی پیدا ہوئی کہ کچھ معاملات ایسے ہیں جنہیں انسان لاکھ کوشش اور دعاؤں سے بھی نہیں بدل سکتا وہ معاملات جیسے انسان کے مقدر میں لکھ دیے گئے ہیں ویسے ہی ہوں گے۔ قدرت کا لکھا کوئی نہیں ٹال سکتا۔ جو لوحِ محفوظ میں لکھ دیا گیا ہے وہ ازل سے ابد تک رہے گا۔ کسی انسان کا ملنا، اس کے ساتھ رہنا اور پھر اس کا بچھڑنا سب کچھ خدا کی طرف سے پہلے سے ہی طے شدہ ہے۔ باقی سب تو اس

سے ملنے اور بچھڑنے کے اسباب ہوتے ہیں۔ سیّد انصر کسی اپنے کے بچھڑنے کو تقدیر سے منسوب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اسے گنوا کے جو ہم کھوئے کھوئے بیٹھے ہیں
یونہی ذرا سا مقدر پہ روئے بیٹھے ہیں(16)

عروج و زوال زندگی کا حصہ ہے۔ زندگی میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں۔ انسان کو جب عروج حاصل ہوتا ہے تو وہ اکثر اوقات خدا کی ذات کو بھول جاتا ہے جس نے عروج بخشا۔ وہ اپنے سے کم تر لوگوں کو حقیر سمجھتا ہے۔ لیکن پھر یہی قسمت کا چکر اسے زوال کی طرف لے آتا ہے۔ اسے یہ مقدر اس دوراہے پر لا کھڑا کرتا ہے کہ جو اسے پسند نہیں ہوتا اسے وہ عطا کر دیا جاتا ہے یا اسے جو پسند ہو وہ اس سے چھین لیا جاتا ہے۔ اس طرح مقدر انسان کو اتنا لاچار و بے بس کر دیتا ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اس کے پاس اتنا اختیار نہیں ہوتا کہ وہ مقدر کا لکھا ٹال سکے۔ ایسی حالت کو سیّد انصر اپنی شاعری میں یوں بیان کرتے ہیں:

توڑ کر پھینک دیا قسمت نے
ترکش وقت میں اک تیر تھے ہم(17)

مقدر انسان کو فرش سے عرش تک لے جاتا ہے اور یہی مقدر انسان کو عرش سے فرش تک لے آتا ہے۔ اس لیے انسان کو ہمیشہ اچھے مقدر کی دعا کرنی چاہیے کیونکہ دعا ایک ایسا عمل ہے جو خدا کی مرضی سے لکھے ہوئے کو بھی بدل سکتا ہے۔

خیر خواہی:

خیر خواہی کا مطلب ہے بھلا چاہنا، خیر اندیشی، دوسروں کے لئے ہمدردی اور خیر سگالی کے جذبات رکھنا۔ یعنی دوسروں کے بارے میں اچھی سوچ رکھنا خیر خواہی ہے۔ اسلام میں خیر خواہی کی تلقین کی گئی ہے۔ جو کوئی بھی مسلمان ہو اس کیلئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ دوسروں کا بھلا چاہے۔ مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اس لیے وہ اپنے بھائی کی خیر خواہی چاہے گا۔ دوسروں کے لیے بری سوچ رکھنا اور اس کے لیے نقصان کے جذبات رکھنا منافقت کہلاتا ہے۔ جس سے اسلام میں منع کیا گیا ہے۔ دین کا مطلب ہی بھلائی چاہنا ہے۔ اسلام میں ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر یہ حق بتایا گیا ہے کہ وہ اس کی عدم موجودگی میں اس کی خیر خواہی کرے۔ سیّد انصر بھی دوسروں کے لیے خیر سگالی کے جذبات رکھتے ہوئے کہتے ہیں:

بڑھ کے سینے سے لگاؤ کہ تھکی ہاری شام
ڈگمگائے ہوئے قدموں سے ادھر آتی ہے(18)

خیر خواہی کی بہت سی صورتیں ہوسکتی ہیں جن میں کسی کو اچھی نصیحت یا اچھا مشورہ دینا، کسی کو پیسوں کی ضرورت ہو تو پیسوں سے اس کی مدد کرنا یا قرض وصول کرنے میں نرمی کرنا، کسی کو نیک کام کرنے کی تلقین کرنا اور برے کاموں سے منع کرنا، جو چیز اپنے لیے پسند ہو وہی چیز دوسرے کے لیے پسند کرنا، کسی کے کام میں تعاون کرنا، کسی کو بروقت چائے پلانا، بھوکے کو کھانا کھلانا، ننگے کو کپڑا پہنانا، کسی کو نوکری دینا اور کسی کا غم مٹانا وغیرہ یہ سب بھلائی کے کام ہیں۔ ان کاموں سے انسانیت کو فروغ ملتا ہے اور اللّٰہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔ سیّد انصر کے دل میں بھی دوسروں کی خیر خواہی کے جذبات پائے جاتے ہیں جسے وہ اپنی شاعری میں یوں بیان کرتے ہیں:

میں صرف اپنے قبیلے کی خیر کیوں مانگوں
کہ ایک جیسے ہیں انساں جہان بھر کے مجھے(19)

بھلائی صرف اپنوں کے لیے نہیں ہونی چاہیے بلکہ یہ اپنے اور پرائے کی تمیز سے بالاتر ہو۔ سب کی بھلائی اور سب کی خیر جیسے جذبات کو فروغ دیا جائے۔ خود پر دوسروں کو فوقیت دینا بھلائی ہے۔ ایسا کام جس میں سب کا فائدہ ہو اس کام سے بہتر ہے جس میں ایک فرد کا فائدہ ہو۔ ذاتی مفاد کی بجائے مفادِ عامہ کو ترجیح دی جائے۔ سیّد انصر بھی ذاتی مفاد کی بجائے مفادِ عامہ کے حق میں ہیں۔ وہ صرف اپنی ہی نہیں بلکہ سب کی بھلائی چاہتے ہیں۔ خیر خواہی صرف یہی نہیں کہ نیک اور اچھے کام کرتے رہیں بلکہ ظالم کو ظلم سے روکنا اور مظلوم کے ساتھ اس کی مدد کے لیے کھڑے ہونا بھی بھلائی ہے۔ طاقتور کے مقابلے میں مظلوم کا ساتھ دینا بھلائی ہے۔ اس لیے قرآن پاک میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا حکم دیا گیا ہے یعنی اچھا کام کرنے کا حکم دیں اور برائی سے منع کریں۔ جس کے پاس جتنی طاقت ہو اسے استعمال کرتے ہوئے وہ نیکی کا حکم دے اور برائی سے منع کرے۔ اگر کوئی برائی کو طاقت سے روک سکتا ہے تو اسے طاقت سے روکے، پیار سے روک سکتا ہے تو پیار سے روکے۔ اگر وہ دونوں کام نہیں کر سکتا تو کم از کم ظلم اور برائی کا ساتھ نہ دے بلکہ اس کے مقابلے میں مظلوم کے لیے خیر سگالی کے جذبات رکھے اور اس کی ہر طرح سے مدد کرنے کی کوشش کرے چاہے وہ واضح طور پر ہو یا پوشیدہ طور پر۔ سیّد انصر کے دل میں مظلوموں کے لیے نرم گوشہ پایا جاتا ہے۔ جب بھی کسی مظلوم کے بارے میں سنتے ہیں تو ان کا دل درد سے تڑپ اٹھتا ہے۔ اس بارے میں وہ لکھتے ہیں:

جب بھی دیتے ہیں سنائی کسی مظلوم کے بین
تڑپ اٹھتا ہے وہیں پر میرے اندر کا حسین(20)

دوسروں کی بھلائی چاہنے والا انسان چاند کی طرح روشن ہوتا ہے۔ جو خود اندھیروں میں سفر کرتا ہے لیکن دوسروں کو روشنی دیتا ہے، مسافروں کو راستہ دکھاتا ہے۔ مسافر چاند کی مدد سے اپنی منازل طے کرتے ہیں۔ اسی طرح سورج کا کام بھی خود جلنا ہے لیکن یہ دوسروں کے لئے حرارت اور روشنی کا باعث ہے۔ سردیوں میں سورج کی کرنیں پودوں اور انسانوں کو حرارت پہنچاتی ہیں۔ درخت اپنا پھل خود نہیں کھاتے اور نہ ہی خود اپنی چھاؤں استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح دنیا کی ہر چیز میں دوسروں کے لیے بھلائی رکھ دی گئی ہے۔ صرف اپنا مفاد کوئی چیز نہیں بلکہ ہر چیز کو دوسروں کے فائدے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔

اردو ادب کے نامور رہنما اور دانشور جو کچھ لکھتے ہیں وہ سب دوسروں کی رہنمائی کے لیے ہے۔ پاکستان کے رہنما قائد اعظم، علامہ اقبال اور لیاقت علی خان جیسے تاریخی رہنماؤں نے مسلمانوں کی آزادی کے لئے جدوجہد کی۔ علامہ اقبال نے الگ ملک کا خواب ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی آزادی کے لیے دیکھا۔ اسی طرح سر سیّد نے مسلمانوں کو ان کی بہتری کے لیے انگریزی تعلیم کی طرف راغب کیا۔ اسی طرح باقی رہنما بھی مسلمانوں کی بھلائی کے لئے کام کرتے رہے۔ سیّد انصر بھی ایسے رہنماؤں میں شامل ہیں جن کا مقصد صرف شعر کہہ کر اپنا نام روشن کرنا نہیں بلکہ وہ اپنی شاعری کے ذریعے دوسروں کی خیر خواہی چاہتے ہیں۔ وہ خود چراغ کی طرح جلتے ہوئے دوسروں کے لیے روشنی کا سبب بنتے ہیں۔ ان کا کام دوسروں کی خیر خواہی ہے۔ اس بارے میں وہ لکھتے ہیں:

میں روشنی کا تسلسل ہوں میرا نام نہ پوچھ
کبھی فلک پہ ستارہ کبھی سناں پہ چراغ(21)

سیّد انصر کے دل میں دوسروں کے لیے خیر سگالی کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ وہ ہمیشہ دوسروں کا بھلا چاہتے ہیں۔ وہ انفرادیت کی بجائے اجتماعیت کو فروغ دیتے ہیں۔ جس جگہ پر دوسروں کے لیے روشنی پیدا نہ کی جاسکے اس کو چھوڑ کر کسی اور جگہ کا انتخاب کیا جائے تاکہ دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کی جاسکیں۔ دوسروں کی بہتری کے لیے وہ ہر ممکن کوشش کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر زمین پر رہتے ہوئے کسی کے لئے مددگار ثابت نہیں ہوسکتے تو بلندی پر جا کر ستارہ بن کر دوسروں کی مدد کریں۔ وہ اسے اپنی شاعری میں یوں بیان کرتے ہیں:

زمین کے دامن صد چاک سے نکل جائیں
چلو ستارہ بنیں خاک سے نکل جائیں(22)

بھلائی زندگی میں سکون اور خوشیوں کا سامان پیدا کرتی ہے۔ جس معاشرے میں بھلائی عام ہو جائے اس معاشرے کو کوئی تباہ نہیں کر سکتا۔ اس لیے اپنی اور معاشرے کی بھلائی کے لیے خیر سگالی کے جذبات رکھے جائیں۔

گمان:

گمان کا مطلب ہے ظن، اندازہ، سوچ، خیال یعنی کسی کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا چاہے وہ بری ہو یا اچھی گمان کہلاتا ہے۔ گمان دو قسم کا ہوتا ہے۔ اچھا گمان اور برا گمان۔ کسی کے بارے میں مثبت خیال رکھنا اور اس کے بارے میں اچھی رائے قائم کرنا اچھا گمان کہلاتا ہے جبکہ کسی کے بارے میں برا خیال رکھنا یا کسی سے بری توقع قائم کرنا بدگمانی کہلاتا ہے۔ کسی کے بارے میں ایسی رائے یا اندازہ قائم کرنا جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ ہو اور کسی کی باتوں سے غلط مفہوم اخذ کرنا بدگمانی ہے۔ بدگمانی رشتوں کو خراب کرنے کا سبب بنتی ہے۔ لوگوں کے آپس کے تعلقات گمان کی بدولت قائم ہوتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ تعلقات اچھے ہونے چاہئیں اور اچھے تعلقات اچھے گمان کی بدولت ہی ممکن ہیں۔ قرآن پاک میں بدگمانی سے منع کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"بہت زیادہ گمان سے بچو بے شک بعض گمان گناہ ہیں" (23)

گمان کو عربی میں ظن کہتے ہیں اور مسلمانوں کو کثرت ظن سے منع کیا گیا ہے کیونکہ بہت زیادہ گمان بدگمانی کی طرف لے جاتا ہے۔ بدگمان شخص خود تو غلط کام کرتا ہے لیکن وہ دوسروں کو بھی غلط ثابت کرنے کے لیے ان کے عیب تلاش کرنے میں لگا رہتا ہے۔ جس سے ایک دوسرے کے لیے نفرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور آپس کے معاملات خراب ہوتے ہیں جبکہ اسلام میں آپس میں محبت و اتفاق سے رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ بعض اوقات گمان رکھنے بھی چاہییں لیکن یہ گمان مثبت ہونے چاہییں کیونکہ گمان رکھنے سے سائنس میں ترقی ہوئی ہے۔ اللہ رب العزت نے انسان کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت عطا کی ہے لہٰذا وہ اسی صلاحیت کو استعمال کرتے ہوئے اچھا گمان رکھے اور دوسروں کے بارے میں اچھی رائے قائم کرے۔ ایک انسان کی دوسرے کے بارے میں یہ رائے ہونی چاہیے کہ انسان خطا کا پتلا ہے۔ ہر انسان سے خطا ہو سکتی ہے جس طرح

ہم سے خطائیں سرزد ہو جاتی ہیں اس طرح دوسروں سے بھی خطائیں ہو سکتی ہیں۔ لیکن وہ انسان خود غلط نہیں ہو سکتا۔ اس سوچ سے آپس کے تعلقات بہتر ہوتے ہیں۔ سیّد انصر نے بھی اپنی شاعری میں وہم و گمان کو پیش کیا ہے وہ دوسروں کے بارے میں ہمیشہ اچھا گمان رکھتے ہیں۔ اس لیے وہ اپنے محبوب کے چھوڑ جانے پر حیران ہوتے ہوئے لکھتے ہیں:

انصر ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تم
یہ کہہ کے چھوڑ دو گے سہارا نہیں ملا(24)

انسان صرف دوسروں کے بارے میں ہی قیاس آرائیاں نہیں کرتا بلکہ وہ اپنے بارے میں بھی وہم و گمان میں مبتلا رہتا ہے۔ بعض اوقات اسے اپنی خوبصورتی پر گمان ہوتا ہے کہ وہ بہت خوبصورت ہے۔ تمام لوگ اس کی خوبصورتی سے متاثر ہو سکتے ہیں۔ اس طرح کسی کو اپنی جوانی، دولت یا رشتے پر گمان ہوتا ہے وہ کہ سب اس کے پاس ہمیشہ رہنے والا ہے، وہ ان خصوصیات سے لوگوں کو متاثر کر سکتا ہے اور وہ ان سے مستقل فائدہ حاصل کرتا رہے گا۔ یہ گمان بعض اوقات فخر و غرور کا باعث بنتا ہے جس سے انسان میں تکبر پیدا ہوتا ہے جو بہت بڑا گناہ ہے۔ جب انسان کے یہ وہم و گمان ٹوٹتے ہیں تو وہ خود بھی اندر سے ٹوٹ جاتا ہے۔ اس طرح اس کا یہ گمان بدگمانی میں بدل جاتا ہے۔ وہ اس گمان کے ٹوٹنے پر خود سے بھی نفرت کرنے لگتا ہے۔ سید انصر کا محبوب بھی اپنے حسن پر نازاں ہے۔ وہ اپنے محبوب کے حسن پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وہ اپنے حسن کے بل پر قیاس کر بیٹھا
کہ اس نے جب بھی پکارا زمانہ آئے گا(25)

کچھ لوگ دوسروں میں نفرت پیدا کرنے کے لیے ان میں بدگمانی پیدا کر دیتے ہیں۔ وہ لوگوں کا آپس میں جھگڑا کروانا چاہتے ہیں تاکہ وہ ایک دوسرے سے دور ہو جائیں اور ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے کدورت پیدا ہو جائے۔ معاشرے میں محبت پیدا کرنے کے لیے آپس میں اچھا گمان رکھنا ہو گا کیونکہ مثبت تعمیری معاشرہ اچھے گمان سے ہی ممکن ہے۔ جس معاشرے یا گھر میں بدگمانی ہو گی اسے تباہ ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ اس لئے سب انسانوں کی کوشش یہ ہو کہ لوگوں کی منفی باتوں میں نہ آئیں بلکہ دوسرے لوگوں میں موجود بدگمانی کو بھی دور کریں تاکہ معاشرے میں امن و سکون قائم کیا جا سکے۔ آج کل رشتے ٹوٹنے کا سب سے بڑا سبب بدگمانی ہے۔ لوگ دوسروں کی باتوں میں آ کر اپنوں سے بدگمان ہو جاتے ہیں اور رشتوں میں دراڑیں پیدا کر لیتے ہیں۔ بدگمانی سے نفرتیں پیدا ہوتی ہیں۔ لوگ کسی کی بات، قول یا فعل سے

اپنے مطلب کا غلط گمان پیدا کر لیتے ہیں حالانکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بات کرنے والے کا مطلب غلط نہ ہو۔ اس کی نیت اچھی ہو۔ اس طرح اپنے ذہن سے منفی مطلب اخذ کرنا بدگمانی کے زمرے میں آتا ہے۔

اگر کوئی نیکی کی نیت سے کسی کی مدد کرتا ہے تو اس کو حسن ظن سے دیکھا جائے نہ کہ بدگمانی سے کہ اس کے دل میں کوئی لالچ یا غرض ہے جس کی وجہ سے وہ اس کی مدد کر رہا ہے۔ ہر رشتہ بنا کسی لالچ کے ہونا چاہیے۔ یہ بدگمان رویہ رشتے کی کمزوری کا سبب بنتا ہے۔ ایک مومن کا رویہ یہ ہونا چاہیے کہ جب وہ کسی کے پاس جائے تو اس کا دل صاف ہو۔ ذہن میں یہ بات ہونی چاہئے کہ اللہ رب العزت نے ہر انسان کا مزاج مختلف بنایا ہے۔ کچھ نرم مزاج ہیں اور کچھ گرم مزاج۔ البتہ نیت سب کی اچھی ہے۔ ایسا رویہ دوسروں کے متعلق خیر خواہی پیدا کرتا ہے۔ بدگمانی سے بچنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ یہ انسان کو ذہنی مریض بنا دیتی ہے کیونکہ بدگمان دوسروں کے بارے میں ہمیشہ منفی سوچ رکھتا ہے۔ جس سے لوگ اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ گمان ہمیشہ مثبت اور تعمیری ہونا چاہیے۔ سیّد انصر بھی اپنے محبوب کے متعلق گمان رکھتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ ان کا محبوب اس سے محبت کرتا ہے۔ وہ اس محبت کو جاننے کے لیے محبوب کی آنکھوں میں جھانکتے ہیں کہ شاید اس کی آنکھوں کے ذریعے محبوب کے دل میں چھپی محبت نظر آ جائے۔ ان کا محبوب کی طرف دیکھنا محبوب کو اس گمان میں مبتلا کر دیتا ہے کہ وہ بہت خوبصورت ہے اس لیے وہ اس کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ سیّد انصر اسے یوں بیان کرتے ہیں:

میں خود کو ڈھونڈتا رہتا ہوں اس کی آنکھوں میں
وہ اس گمان میں ہے اس کو دیکھتا ہوں میں(26)

محبت کا گمان انسان کو خوبصورت جذبات عطا کرتا ہے۔ اس کا دل خوشی سے بھر جاتا ہے۔ محبوب کی سوچ اس کے چہرے پر مسکراہٹ لے آتی ہے۔ اس طرح خوش گمانی انسان میں محبت و مروت کے جذبات پیدا کرتی ہے۔

اُداسی:

اُداسی ایک مایوس کن اور بیزاری کی کیفیت ہے جو انسان کے احساسات، جذبات، رویے، رجحان، خوشی اور غم جیسے تاثرات پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ مستقل اداسی مایوس کن خیالات کے سبب پیدا ہوتی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کا خیال ہے:

"اداسی اور مایوسی کو اپنے بدن کے اندر تحلیل نہ ہونے دیں ورنہ یہ آپ کو چاٹ کھائے گی۔"(27)

اُداسی کی بہت سی وجوہات ہیں۔ جن میں کسی کی یاد، کسی شخص یا چیز کا نہ ملنا یا مل کر کھو جانا، کسی کو پانے کی تمنا، اپنوں کی بے رخی اور اپنوں سے ملا درد، کسی سے بچھڑنے کا غم، کسی حادثے کا خوف اور زندگی کی مشکلات وغیرہ شامل ہیں۔

زندگی میں دکھ اور سکھ دونوں پائے جاتے ہیں۔ انسانی دل پر یہ دنوں کیفیتیں اثرانداز ہوتی ہیں لیکن خوشی کی نسبت اداسی کے اثرات دیرپا ہوتے ہیں۔ اکثر ہر خوشی کے بعد اداسی ہوتی ہے۔ یہ ہر جذبے اور احساس سے طویل ہوتی ہے۔ اس کے اثرات دوسرے احساسات کی نسبت زیادہ ہوتے ہیں۔ کسی اپنے کے ساتھ بیتائے ہوئے خوشی کے پل یاد آنے پر دل میں جدائی کی اداسی بھر جاتی ہے۔ اپنوں سے بچھڑنے کا غم ایک ایسا درد ہے جو مستقل اداسی کا سبب بن جاتا ہے۔ اپنوں کی جدائی انسان کی روح کو زخمی کر دیتی ہے۔ یہ اداسی نہ صرف انسان کو اندر ہی اندر چاٹ کھاتی ہے بلکہ انسان کو باہر سے بھی افسردہ رکھتی ہے۔ انسان کو باہر کا موسم بالکل اچھا نہیں لگتا کیونکہ اس کا دل اداسی سے بھرا ہوتا ہے۔ ہر کام سے اس کا دل اچاٹ ہو جاتا ہے۔ چاہے کتنی ہی پر لطف محفلیں ہو رہی ہوں انسان کا دل ان محفلوں میں نہیں لگتا۔ ان رنگ برنگی محفلوں سے اداس دل کو کوئی غرض نہیں ہوتی بلکہ یہ رونقیں اس کے دل کو مزید خالی پن کا احساس دلاتی ہیں۔ اداسی کی حالت میں انسان اندر سے ٹوٹ کر بکھر چکا ہوتا ہے۔ پھر دوسرے شخص کا دلاسہ ، تسلی اور تشفی کسی کام نہیں آتی۔ افسردہ انسان کو کوئی اپنا ہمدرد محسوس نہیں ہوتا بلکہ اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ سب لوگ اس کی بے بسی کا تماشہ دیکھ رہے ہیں اس بارے میں سیّد انصر لکھتے ہیں:

بکھر چکا ہوں کوئی تو سمیٹنے آئے
جو آئے وہ بھی تماشا ہی دیکھنے آئے(28)

اُداسی میں بہار کا موسم بھی خزاں جیسا ہی لگتا ہے۔ موسم بہار کی ٹھنڈی ہوائیں، جھومتے درخت، کھکھلاتے پھول اور خوبصورت چہچہاتے پرندے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ ہر چیز میں اداسی نظر آتی ہے۔ ہر ہنستا مسکراتا چہرہ حسین لگنے کی بجائے برا لگتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ ہنستے مسکراتے چہرے اس شخص کی بے بسی کا مذاق اڑا رہے ہوں۔ دل اس قدر تاریک ہو جاتا ہے کہ جیسے دنیا سے روشنی ختم ہو گئی ہو۔ اداسی اجالوں پر غالب آجاتی ہے۔ اداسی میں امید ختم ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یوں لگتا ہے دنیا کے سارے غم اس اداس شخص

کی جھولی میں بھر دیے گئے ہوں۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور مسکراہٹیں بھی انسان کے لیے کچھ معنی نہیں رکھتیں۔ وہ اندھیروں کو اپنی زندگی کا ہمسفر بنالیتا ہے۔ کوئی دوست یا ہمدرد بھی اسے غم خوار نہیں لگتا۔ ایک شخص سے ملا درد اسے سارے رشتوں سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ پھر اسے ہر رشتہ جھوٹا اور بے وفا لگتا ہے۔ اداس شخص لاکھ کوششوں سے بھی اپنے آپ کو خوش نہیں کر سکتا۔ شاعر نے بھی اس بات کا اظہار کیا ہے کہ انسانی زندگی میں مشکلات و مصائب اس قدر بڑھ جاتے ہیں تو وہ یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے یا الٰہی زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے یعنی زندگی میں اس قدر مشکلات کا سامنا ہے کہ انسان پریشان ہو کر رہ جاتا ہے۔ زندگی کے بارے میں ڈاکٹر یوسف حسین خان لکھتے ہیں:

> "جدید زمانے کا انسان آج اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی جس منزل میں ہو وہ سوچ رہا ہے کہ آیا زندگی اس قابل ہے کہ زندہ رہا جائے۔ اس میں ایک عجیب جنجھناہٹ الجھن اور بے زاری کی کیفیت پائی جاتی ہے فرد اپنی شناخت کھو چکا ہے۔ قدروں کا احترام اٹھ گیا ہے"(29)

جب تک بے بسی کے لمحات ختم نا ہو جائیں اداسی ختم نہیں ہو سکتی۔ اداسی انسان کے اندر اس طرح ڈیرہ جما لیتی ہے کہ یہ جیتے جاگتے انسان کو اندر سے مار دیتی ہے۔ اسے دنیا کا ہر رشتہ بوجھ لگنے لگتا ہے جسے نبھانا دنیا کا مشکل ترین کام ہو۔ تب محبت، پیار، ہمدردی، احساس، شفقت و مروت کے سب احساسات ختم ہو جاتے ہیں۔ ایسا انسان کسی جذبے کو محسوس نہیں کر سکتا۔ انسان کے احساسات مر جاتے ہیں۔ وہ اداس انسان کسی کے دکھ درد کو محسوس نہیں کر سکتا۔ ایسے انسان کے اندر جو تھوڑی سی امید باقی ہوتی ہے وہ اسے زندہ رکھنے کا سبب بنتی ہے۔ لیکن جب وہ امید کی کرن بھی ختم ہو جاتی ہے تو انسان مزید بکھر جاتا ہے۔ سیّد انصر اسے اپنی شاعری میں یوں بیان کرتے ہیں:

> پھر کسی جلتی ہوئی آس نے دم توڑا ہے
> کھولتے ہوئے خون کی اک بوند گری ہے دل پر(30)

یہ اداسی انسان کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ جس کی وجہ سے دل سے صرف دھواں ہی اٹھتا ہے۔ جس دل سے روشنی نکلنے کی امید ہوتی ہے، جو خود روشن ہو کر دوسروں کو خوشیاں دے سکتا ہے، جب اس دل سے صرف دھواں ہی اٹھے گا تو وہ دوسروں کو بھی جلا کر راکھ کرے گا۔ ایسا انسان نہ چاہتے ہوئے بھی دوسروں کو تکلیف دے دیتا ہے۔ اداس انسان خود غرض بن جاتا ہے جو صرف خود کی دنیا میں ہی رہنا پسند کرتا ہے کیونکہ

جب تک انسان کا اپنا دل خوش نہ ہو وہ دوسروں کے لیے خوشی کا سبب کیسے بن سکتا ہے۔ اداس لوگوں کے پاس اداسی ہوتی ہے جو اپنے ساتھ دوسروں کو بھی دکھی کر جاتی ہے۔ یہ کیفیت انسان کو بے بس کر دیتی ہے۔ بعض اوقات مستقل اداسی انسان کو مکمل طور پر مایوس کر دیتی ہے جو اسے قبر تک لے جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ انسان کی زندگی کا ختم ہو جانا ہے۔ کچھ نازک دل لوگ اس اداسی کو برداشت نہیں کر پاتے اور خودکشی جیسے جرم کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں تا کہ اس مایوسی سے ان کی جان چھوٹ جائے۔ مستقل اداسی سے انسان کی زندگی پر ایسی کیفیات چھا جاتی ہیں کہ اس کے لیے کسی شخص کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہو جاتا ہے۔ سیّد انصر اس بارے میں لکھتے ہیں:

دیکھا یہ سانحہ بھی دل نامراد نے
جب آنکھیں خشک ہو گئیں سپنے ہرے ہوئے(31)

ایسی چیز جس کی انسان کو شدید تمنا تھی وہ ان لمحات میں ملے جب اس کے ملنے کی آس ختم ہو جائے تب اس کے دل میں وہ جذبات مر جاتے ہیں جو اس کی خوشی کا سبب تھے جس کے لیے اس نے آخری حد تک خواہش کی تھی۔ جب انسان لاحاصل کو رو رو کر تھک جاتا ہے تو اس چیز کے حصول کی تمنا ختم ہو جاتی ہے۔ پھر وہ چیز یا شخص اسے اچانک مل بھی جائے تو اسے وہ خوشی نہیں دے سکتے جو اس کی اداسی کو ختم کر سکیں۔

شکوہ و شکایت:

شکوہ کا مطلب شکایت، گلہ اور رعب و داب وغیرہ ہے۔ شکوہ کسی تکلیف، دکھ، درد اور رنج و غم پر کسی دوسرے شخص سے اس دکھ کی بات کا اظہار کرنا ہے لیکن یہ بات صرف حقیقت پر مبنی ہو، اس میں کسی قسم کی ملاوٹ نہ ہو۔

یہ شکوہ دو لوگوں کا آپس میں، ایک انسان کا دوسرے انسان سے اور ایک انسان کا خدا سے بھی ہو سکتا ہے۔ اس طرح ایک شخص جس چیز کی توقع کسی دوسرے انسان یا خدا سے کر رہا ہوتا ہے وہ اسے نہ ملے اور اگر کوئی کام اس کی توقع کے برعکس ہو تو وہ اس بات پر شکوہ کرتا ہے کہ میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا۔ توقعات کا پورا نہ ہونا شکوہ و شکایت کا سبب بنتا ہے۔ یہ شکوہ حد سے زیادہ ہو جائے تو انسان ناشکرے پن کا شکار ہو جاتا ہے۔ جس زبان کو شکوہ شکایت کی لت لگ جائے پھر وہ زبان شکر ادا کرنا بھول جاتی ہے اور صبر اس کی زندگی سے ختم

ہو جاتا ہے۔ ہر وقت شکوہ شکایت کرنے والے انسان سے لوگ بد ظن ہو جاتے ہیں اور اس کے پاس بیٹھنا بھی پسند نہیں کرتے۔

اُردو ادب کے مختلف ادیبوں نے شکوہ پر قلم اٹھایا ہے۔ علامہ اقبال نے تو پوری نظم ہی شکوہ کے عنوان سے لکھی ہے۔ جس میں انہوں نے مسلمانوں کے زوال کا شکوہ خدا سے کیا ہے کہ تیرے نام لیوا تو مسلمان ہیں جبکہ انعام واکرام کی بارش غیر مسلموں پر ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کی بے عملی، غفلت اور دین سے دوری کی بنا پر مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگانے کے لیے طنزیہ انداز میں خدا سے شکوہ کرتے ہوئے یہ نظم لکھی۔ جو ان کی کتاب بانگ درا میں شامل ہے۔ اسی طرح اور بھی بہت سے شعرا نے شکوہ کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔

سیّد انصر نے بھی اسی شکوہ کو اپنی شاعری میں شامل کیا ہے۔ شاعری میں عموماً عاشق اپنے محبوب یا خدا سے شکوہ کرتے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ جب انسان غم کی کیفیت میں ہوتا ہے تو کچھ عرصہ وہ خوشی کا انتظار کرتا ہے لیکن جب یہ انتظار طویل ہو جاتا ہے اور اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگتا ہے تو اس پر وہ مزید صبر کی بجائے اپنے محبوب سے شکوہ کرنے لگتا ہے۔ شکوہ ہمیشہ کسی کی محبت میں ہوتا ہے۔ کسی چیز کی خواہش بھی شکوہ و شکایت کا سبب بنتی ہے۔ شکایت وہاں ہوتی ہے جہاں محبت ہو۔ جہاں محبت ہی نہ ہو وہاں پر شکایت کا کوئی جواز نہیں رہتا۔ اس طرح جس چیز کی طلب یا تمنا انسان نے کی ہو اس چیز سے ساری دُنیا کے خزانے بھی بھرے ہوئے ہوں لیکن وہ چیز کسی مجبوری کی بنا پر اس شخص کی دسترس سے باہر ہو تو وہ چیز اس شخص کے کسی کام کی نہیں۔ اس کا ہونا یا نہ ہونا اس شخص کے لیے برابر ہے۔ اسے اس چیز کا کوئی فائدہ نہیں جب وہ کام ہی نہیں آ سکتی۔ سیّد انصر بھی خدا کی محبت میں خدا سے شکایت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

صدیاں گزر گئیں ہمیں پیاسے مرے ہوئے
کس کام کے ہیں تیرے سمندر بھرے ہوئے(32)

انسان کسی کی محبت میں کھو کر ساری دنیا کو بھول سکتا ہے۔ محبوب کو اپنی محبت کا یقین دلانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ وہ اسے ساری دنیا کی خوشیاں دینا چاہتا ہے۔ وہ اپنے محبوب کی ہر خواہش کو پورا کرتا ہے تاکہ اس کا محبوب اس سے خوش ہو جائے۔ اس طرح وہ اپنی کوششوں میں کسی حد تک کامیاب رہتا ہے۔ جس سے اس کا محبوب اس کی محبت پر یقین کرنے لگتا ہے اور بدلے میں اسے بھی محبت سے نوازتا ہے۔ اس طرح دونوں میں محبت کا تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات کسی مجبوری کی بنا پر محبوب کی کسی خواہش کو پورا نہیں

کر پاتا اور اسے وہ خوشی نہیں دے پاتا جس کی محبوب نے تمنا کی تھی۔ اس طرح محبوب اس کی محبت پر یقین کرنے کے باوجود اس سے شکوہ کرتا ہے کہ اب وہ بے وفا ہو گیا ہے اس لیے وہ اس کی کوئی خواہش پوری نہیں کر پا رہا۔ اسی بات کو سیّد انصر یوں بیان کرتے ہیں:

یقین صدق محبت کے باوجود انصر
اسے گلہ ہے کہ تھوڑا سا بے وفا ہوں میں(33)

بعض اوقات انسان کسی ایسے شخص سے محبت کر بیٹھتا ہے جو بدلے میں اسے بے وفائی سے نوازتا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ محبوب سے محبت کرتا ہے۔ محبوب کی بے وفائی نظر آنے پر بھی وہ اسے نظر انداز کرتا ہے کہ شاید اس کا محبوب اسے بدلے میں محبت سے نواز دے اور اس کی بے لوث محبت پر یقین کر لے۔ وہ محبوب کو پانے کے لیے ہر وہ کام کرتا ہے جو اس کا محبوب چاہتا ہے۔ چاہے وہ کام اس کے لیے نقصان کا سبب ہی کیوں نہ بنے۔ وہ کسی بھی طرح محبوب کی محبت پانا چاہتا ہے۔ محبت میں کھو کر انسان خود کو بھول جاتا ہے۔ ہر طرف محبوب کا چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ محبوب کی خوشی، اس کا ہنستا مسکراتا چہرہ، اس کی کھلکھلاتی ہوئی آوازوں کی گونج اسے ہر سمت سنائی دیتی ہے۔ وہ اسکی محبت میں مست ہو کر ہر طرف سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ صرف محبوب کا عکس ہی اس کے حواسوں پر چھایا ہوتا ہے۔ جب اس کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی شدید محبت صرف ایک سراب ہے جس کا وہ تعاقب کر رہا تھا، وہ ایسے شخص سے محبت کر رہا تھا جو اسے کبھی پیار نہیں دے سکتا، جو اس سے مسلسل بے وفائی کرتا رہا ہے اور یہ محبت اس کے لئے صرف خسارے اور نقصان کا سبب بنی ہے تو وہ خود ہی سے شکوہ کرتا ہے کہ اس سراب کا تعاقب کیوں کیا جس کی کوئی منزل ہی نہیں تھی اور جس میں صرف اس کا نقصان تھا۔ سیّد انصر اسے اپنی شاعری میں یوں بیان کرتے ہیں:

کاغذ کی کشتیوں میں سواری کا شوق تھا
اب یہ شکایتیں ہیں کنارہ نہیں ملا(34)

بعض اوقات دکھ کسی انسان کا مقدر بن جاتا ہے۔ غریب انسان مسلسل محنت پر بھی معاشرے میں وہ عزت حاصل نہیں کر پاتا جو کسی امیر کو حاصل ہوتی ہے۔ کچھ انسان مسلسل محنت کرتے ہیں لیکن وہ مقام حاصل نہیں کر پاتے جس کی انہوں نے تمنا کی ہو۔ انہیں اپنی یہ محنت بہت بڑی دکھائی دیتی ہے لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے اس مقام تک پہنچنے کے لئے ان کی محنت کم ہو۔ اس طرح ایک شہر یا گھر میں رہتے ہوئے بھی محبت کے پیمانے سب کے لیے الگ ہوتے ہیں کسی سے زیادہ محبت ہوتی ہے اور کسی سے کم۔ جس کو محبت اور توجہ کم ملے

وہ شکوہ کناں ہوتا ہے کہ اس کو وہ محبت نہیں ملی جو اس کا حق تھی۔ وہ محبت وہ خلوص وہ انعام اسے کیوں نہیں ملا جس کا وہ حقدار تھا۔ اگر اس سے اسے کچھ ملا بھی تو وہ اتنا کم تھا کہ اس کے کسی کام نہ آ سکا۔ سیّد انصر اسے اپنی شاعری میں یوں بیان کرتے ہیں:

تمازتیں ہی ملیں شہر سایہ داراں میں
کسی نے چھاؤں نہ دی سائباں بھر کے مجھے(35)

جس شہر اور گھر میں محبتوں کا بسیرا ہو، جس میں ہر طرف محبت کے پھول اور خوشبو کا بسیرا ہو، ایک غریب کو اس گھر اور شہر سے نفرتیں ہی ملیں گی کیونکہ اس کی غربت نے کسی کو اس کی محبت میں مبتلا نہیں ہونے دیا اور محبتوں کے شہر میں اس کو دکھ اور غم ہی ملے۔ اس کا یہ دکھ خدا اور دنیا دونوں سے شکایت کا سبب بنتا ہے۔

ریاکاری:

ریاکاری کا مطلب ہے کسی سے عزت افزائی یا تعریف حاصل کرنے کے لیے دکھاوے کے طور پر کوئی کام کرنا تاکہ لوگ اس کی تعریف کریں اور اس کام سے اسے کوئی دنیاوی فائدہ یا شہرت حاصل ہو۔ اسلام میں ریاکاری سے منع کیا گیا ہے۔ انسان کا ہر عمل خالص خدا کے لیے ہونا چاہیے نہ کہ انسانوں کو دکھانے کے لیے۔ خدا کے پاس وہی عمل قبولیت والا ہے جو صرف نیک نیت اور اخلاص سے کیا جائے۔ سیّد انصر نے ریاکاری کو بھی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ جدید غزل میں روایتی عشق و عاشقی سے ہٹ کر بہت سے سماجی اور اخلاقی موضوعات کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔ اس ضمن میں سنبل نگار لکھتی ہیں:

"جب غزل کا آغاز ہوا تو وہ حسن و عشق کی باتوں تک ہی محدود تھی لیکن یہ صورتِ حال زیادہ عرصہ برقرار نہ رہی اور اس کا دامن برابر وسیع تر ہوتا گیا۔ آج یہ صورت حال ہے کہ حیات و کائنات کا کوئی ایسا موضوع نہیں جو کامیابی کے ساتھ غزل میں پیش نہ کیا گیا ہو۔"(36)

موجودہ دور میں ہر شخص اپنی ظاہری حالت بہتر بنانے کے چکر میں ہے اور باطن کی کسی کو کوئی پروا نہیں کیونکہ آج کل ہر کوئی ظاہری بناوٹ اور خوبصورتی کو ترجیح دیتا ہے۔ اندرونی خوبصورتی کوئی نہیں دیکھتا اور کسی کا باطن کتنا خوبصورت ہے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ اس لیے لوگ اپنے ظاہر کو بہتر سے بہتر بنانے کے چکر میں ہیں جس کے لیے وہ اپنے باطن کو آلودہ کیے جا رہے ہیں۔ یہاں سب کو اس کی ظاہری حالت کی وجہ

سے عزت ملتی ہے۔ جس کے پاس خوبصورت شکل، لباس، گاڑی اور گھر ہو لوگ اسی کی عزت کرتے ہیں۔ جس کے پاس دوسروں پر لٹانے کے لیے روپیہ پیسہ اور مال و دولت ہو لوگ اسی سے دوستی کرنا پسند کرتے ہیں۔ جن کے پاس عمدہ اخلاق اور خوبصورت دل ہو لیکن ظاہری آن بان نہ ہو تو لوگ اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ سیّد انصر اسے اپنی شاعری میں یوں بیان کرتے ہیں:

سلام کرتا ہے ہر کوئی چڑھتے سورج کو
برا نہ مان کہ یہ دور ہی ریا کا ہے(37)

اس طرح انسان کسی کی خوشنودی کے لئے اس سے ظاہری محبت جتاتا ہے، پیٹھ پیچھے لوگوں سے اس کی برائیاں کرتا ہے اور اس کو نقصان پہنچانے کی تدابیر سوچتا ہے۔ ایسے رویے میں ریاکاری کے ساتھ ساتھ منافقت بھی شامل ہو جاتی ہے جو انسان کو دنیا و آخرت میں رسوا کر دیتی ہے۔ ریاکار لوگ کسی کو خوش کرنے کے لیے اس کی خوشامد کرتے ہیں اور اس کو دکھانے کے لیے اچھے اعمال کرتے ہیں۔ جب یہ کوئی لالچ یا مفاد حاصل کر لیتے ہیں تو اپنا مطلب پورا ہونے پر بالکل بدل جاتے ہیں اور بعض اوقات دوسروں کے لیے نقصان کا باعث بھی بنتے ہیں۔

اس طرح کچھ لوگ اپنی برتری ظاہر کرنے کے لیے خود کو امیر کبیر ظاہر کرتے ہیں۔ تاکہ لوگ ان کی عزت کریں اور ان کی بات مانیں۔ ایسے لوگوں کی آمدن اگرچہ کم ہو لیکن وہ قرض لے کر اپنے ظاہری رکھ رکھاؤ کو قائم رکھتے ہیں کیونکہ وہ اس ریاکاری کے عادی ہو چکے ہوتے ہیں۔ امیر لوگوں کو سبھی پسند کرتے ہیں جبکہ غریب کی طرف کوئی دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ یہ ریاکار لوگ غربا سے محض مجبوری میں کوئی کام نکلوانے کے لیے بات کرتے ہیں ورنہ ان سے بات کرنے پر بھی ناگواری محسوس کرتے ہیں اور ان کی دل آزاری کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ سیّد انصر اسے اپنی شاعری میں یوں بیان کرتے ہیں:

ہر کوئی روند کر گزرتا ہے
بے خطا ہوں، یہی خطا ہے میری(38)

امیر لوگ غریبوں کا استحصال کرتے ہیں۔ غریب لوگ اپنی غربت کو ختم کرنے کے لیے بعض ناجائز طریقے بھی استعمال کرتے ہیں جن میں چوری، ڈاکہ زنی اور قتل و غارت وغیرہ شامل ہیں۔ ریاکاری سے معاشرے میں نفرت کے جذبات پروان چڑھتے ہیں۔ جب سادہ دل غربا کو کوئی پوچھتا نہیں تو یہ غریب لوگ

امرا کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت برداشت نہیں کرسکتے۔ امرا کی امارت سے متاثر ہو کر خود بھی امیر ہونے کے خواب دیکھتے ہیں اور ان امرا سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔

سادہ دل لوگوں کی مجبوری ولاچاری کو کوئی نہیں سمجھتا بلکہ سب اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اسلام میں سادگی کو پسند کیا گیا ہے جب کہ ہمارے معاشرے میں سادہ انسان کی کوئی عزت نہیں۔ جب سادہ دل لوگ معاشرے میں اپنا یہ مقام دیکھتے ہیں تو وہ بھی ظاہری طور پر خود کو بہتر سے بہتر بنانے کے چکر میں لگ جاتے ہیں۔ اس طرح معاشرے میں صرف ریاکاری ہی رہ جاتی ہے۔ اس طرح لوگ اندرونی خوبصورتی، اچھے اخلاق، حق گوئی، صبر وبرداشت، تحمل مزاجی، نیک نیتی اور بہادری جیسے اوصاف کو چھوڑ کر مال وزر کمانے کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ تاکہ مال وزر حاصل کرنے پر وہ بہترین کپڑا، کھانا، گاڑی اور بہترین گھر جیسی سہولیات سے لطف اندوز ہو سکیں۔ اس طرح ریاکاری کے اس دور میں بڑوں کا ادب واحترام بھی ختم ہوتا جارہا ہے۔ بڑوں کے ساتھ بدتمیزی سے بات کرنے کو پراعتمادی اور اپنے حقوق کے استعمال کا نام دیا جاتا ہے۔ تعلیمی اداروں میں صرف ڈگریاں حاصل کرنے پر توجہ دی جاتی ہے جبکہ ان میں دی گئی تعلیمات کسی کو یاد نہیں ہوتیں۔ اس طرح یہ ڈگری ہولڈر پر اعتماد لوگ سادہ دل لوگوں کی سادگی اور بے بسی کو دیکھ کر ان سے ہمدردی کی بجائے ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ سیّد انصر سادہ دل لوگوں کی بے بسی پر یوں لکھتے ہیں:

سبھی رکھتے ہیں پیرہن پہ نظر
بے بسی کون دیکھتا ہے میری(39)

سادہ لوگ معصوم اور دل کے سچے ہوتے ہیں۔ ان کے دل ہر قسم کے تعصب سے پاک ہوتے ہیں۔ وہ خود دوسروں کے لیے پاکیزہ جذبات رکھتے ہیں۔ اس لئے انہیں باقی لوگ بھی سچے اور معصوم لگتے ہیں۔ وہ دوسروں کے ساتھ ہمدردی اور محبت کے جذبات رکھتے ہیں۔ وہ دوسروں کی بھلائی کے لئے کام کرتے ہیں۔ ان کا باطن ان کے ظاہر کی طرح صاف وشفاف ہوتا ہے اور وہ کسی کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ اس لئے دوسروں سے بھی یہی توقع رکھتے ہیں کہ وہ انہیں دھوکا نہیں دیں گے۔ ان کا علم ان کے اخلاق وانداز میں نظر آتا ہے۔ ان کا اچھا اخلاق، دوسروں کے ساتھ ان کا برتاؤ، سادہ انداز، ان کی خوش گفتاری اور زبان کی سچائی ان کے کردار کی گواہی دے رہے ہوتے ہیں جبکہ اس کے برعکس ریاکار لوگ منافقت سے لبریز ہوتے ہیں اور ان میں غرور و گھمنڈ پایا جاتا ہے۔ وہ خود کو بہت اعلیٰ شے سمجھتے ہیں۔ وہ دوسرے لوگوں سے کام نکلوانے کے لیے ان کی معصومیت کا مذاق اڑاتے ہیں۔ منافقت کا لبادہ اوڑھ کر اپنی چکنی چپڑی باتوں سے معصوم لوگوں کو شیشے میں

اتارتے ہیں اور ان کو بے وقوف بنا کر اپنا کام نکلوا لیتے ہیں۔ ایسے ریاکار لوگ معصوم لوگوں کا مذاق اڑانے کے ساتھ ساتھ ان کو نقصان پہنچانے کے بھی درپے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا باطن کچھ اور ہوتا ہے، ظاہر کچھ اور۔ یہ لوگ اپنے گناہوں کو سادہ دل لوگوں کے سر تھوپ کر انہیں مشکلات میں گرفتار کر دیتے ہیں۔ سیّد انصر اس بارے میں لکھتے ہیں:

دنیا والے ہم جیسے سادہ دل لوگوں کو
پھول دکھا کر زنجیریں پہنائے جاتے ہیں(40)

اخلاص ایسی صفت ہے جو اللہ تعالی کو بہت پسند ہے۔ اخلاص سے کیا گیا عمل خدا کے نزدیک پسندیدہ فعل ہے۔ ریاکاری نہ صرف انسان کے اپنے لئے بلکہ معاشرے کے لئے بھی نقصان دہ ہے۔ ریاکار کی خدا کے ہاں بھی کوئی عزت نہیں۔ ریاکار کے اچھے اعمال بھی اس کے کسی کام نہیں آتے کیونکہ وہ یہ اعمال دنیاوی فائدے کے لیے کرتا ہے لہذا اسے دنیا میں اس کام کا صلہ مل جاتا ہے۔ خدا کے ہاں صرف اخلاص کو ہی فوقیت حاصل ہے۔

آلام و مصائب:

آلام و مصائب زندگی کا حصہ ہیں۔ کوئی بھی شخص مستقل سکون کی زندگی نہیں گزار سکتا۔ اللہ تعالی ہر انسان کو مصائب و مشکلات سے گزارتے ہیں تاکہ یہ جان لیں اس کے کونسے بندے صبر اور ایمان والے ہیں اور کون مشکلات پر صبر کرنے کی بجائے خدا کی ناشکری کرتے ہیں۔ انسان کو اس زندگی میں مختلف مصائب و مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان ان مسائل پر واویلا کرنے کی بجائے صبر و شکر کا دامن اپنے ہاتھ سے نہ جانے دے بلکہ صبر و شکر سے مصیبت کے اس مرحلے سے گزرے۔ اس سے نپٹنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انسان سوچے کہ یہ زندگی عارضی ہے، یہاں چند دن کا ٹھکانہ ہے، آخرت کی زندگی ہی دائمی اور ہمیشہ رہنے والی زندگی ہے، یہ عمل کی جگہ ہے اور اس کا بدلہ آخرت میں ملے گا۔ اس سوچ سے انسان کے دل میں مصائب کو جھیلنے کی طاقت پیدا ہوتی ہے۔ اس سے انسان کے اندر صبر کے جذبات پروان چڑھتے ہیں۔ مصائب پر صبر کرنے سے اسے خدا سے بھی اجر و ثواب ملے گا اور مشکلات بھی جلد کم ہو جائیں گی۔ ایسا رویہ اور ایسی سوچ انسان کو مضبوط بناتی ہے۔ ان مصیبتوں کی نوعیت کوئی بھی ہو سکتی ہے۔ انسان کسی بھی قسم کی پریشانی میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ کسی بیماری، تکلیف، افلاس و تنگدستی یا پھر قرض کی مصیبت میں مبتلا ہو

سکتا ہے۔ ایسے حالات میں انسان خود کو بے بس اور تنہا محسوس کرتا ہے کیونکہ دنیا کا دستور ہے کہ خوشحال آدمی کا ہر کوئی دوست ہوتا ہے لیکن مصیبت میں سب ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ قریبی دوست واحباب جن پر انسان کو بہت اعتماد ہوتا ہے وہ بھی اسے مصیبت میں دیکھ کر اکیلا چھوڑ دیتے ہیں۔ سیّد انصر نے اس مصیبت کے وقت کو اپنی شاعری میں یوں بیان کیا ہے:

سر پہ آجائے جو سورج انصر
پھر تو سائے بھی سکڑ جاتے ہیں(41)

انسان کو اس مصیبت سے نکلنے کے لیے دنیاوی سہارے ڈھونڈنے کی بجائے خود کوشش کرنی چاہیے اور اس کے لیے خدا سے بھی دعا کرنی چاہیے۔ اس کے لیے اسے نیک اعمال کرنے ہوں گے۔ اسے چاہیے کہ دوسروں کے کام میں آسانی پیدا کرے کیونکہ جو لوگ دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کرتے ہیں، اللہ تعالی ان کے لئے آسانیاں پیدا کرتے ہیں اور ان کی مشکلات ختم کر دیتے ہیں۔ اگر اس سے کوئی غلطی یا گناہ سرزد ہو گیا ہو تو خدا سے توبہ و استغفار کرے اور اس کے ساتھ ساتھ دنیاوی کوششیں بھی جاری رکھے۔ مثلاً اگر کوئی شخص بیماری میں مبتلا ہے تو اس کے لیے علاج کا انتظام کرے۔ اگر تنگدستی میں مبتلا ہے تو تقدیر کا بہانہ بنا کر ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہ بیٹھے بلکہ محنت و مزدوری کرے۔ اپنی انا کو پس پشت ڈال کر جس طرح کا بھی کام ملے اسے کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ وہ یہ سوچ نہ رکھے کہ اسے کوئی دنیاوی شان و شوکت والی ملازمت ملے گی تب ہی وہ کام کرے گا بلکہ وہ دیانتداری سے محنت کو اپنا شعار بنائے۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان پر آئی ہوئی آزمائشیں اور مصیبتیں صرف ان کے گناہوں کی سزا ہے جبکہ حقیقت اس کے برعکس بھی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ بہت سے انبیا اور نیک بندوں پر بھی آزمائشیں اور مصیبتیں نازل ہوئیں۔ وہ اللہ کے نیک بندے تھے کیونکہ پیغمبر ہمیشہ معصوم ہوتے ہیں وہ گناہگار نہیں ہوتے۔ اللہ تعالی اپنے نیک بندوں کو بھی دنیاوی آزمائشوں اور مصیبتوں سے گزارتے ہیں تاکہ ان کے صبر کا اجر انہیں دنیا میں بھی ملے اور آخرت میں بھی۔ کچھ مصیبتیں انسانوں کی پہچان کروانے کے لیے آتی ہیں۔ ایسے لوگ جو خوشحالی میں انسان کے ساتھ ہوتے ہیں، جنہیں انسان اپنا دوست و ہمدرد سمجھتا ہے کہ یہ لوگ اسے مصیبت میں تنہا نہیں چھوڑیں گے۔ جن دوستوں کے لئے انسان خدا کی نافرمانی کرتا ہے اور گناہوں کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔ جو دوست خوشحالی میں جان دینے کے دعویدار ہوتے ہیں وہی دوست مصیبت پڑنے پر نہ صرف

اسے اکیلا چھوڑ دیتے ہیں بلکہ اسے ایسی باتیں سناتے ہیں جیسے یہ مصیبت اس کی پیدا کردہ ہو اور وہ ہمیشہ اس میں مبتلا رہے گا۔ سیّد انصر ان حالات میں لوگوں کے رویے کو یوں بیان کرتے ہیں:

دعویٰ تھا جنہیں جان چھڑکنے کا وہی لوگ
لمحات مصیبت میں میرے کام نہ آئے(42)

ان حالات سے انسان کو اچھے اور برے کی پہچان بھی ہو جاتی ہے کون سچا ہے، کون اس کے ساتھ مخلص ہے اور کون صرف ظاہری طور پر اس کا دوست ہے۔ بعض اوقات یہ مصیبتیں انسان میں پیدا ہونے والے تکبر کو بھی ختم کرنے کا سبب بنتی ہیں تاکہ انسان جان لے کہ ہر چیز کا مالک خدا ہے۔ وہ جس کو جب چاہے نواز دے اور جب چاہے اس سے چھین لے۔ اقتدار اعلیٰ صرف خدا کی ذات ہے، وہی انسان کا حقیقی اور یکتا سہارا ہے۔ لہٰذا اسے خدا کی طرف سے دیے گئے احکامات پر ہی عمل پیرا ہو کر زندگی گزارنی ہے۔

حق گوئی:

اس کا مطلب سچی بات کرنا حق کا ساتھ دینا، ہمیشہ سچ بولنا، راست گوئی اختیار کرنا اور صداقت شعاری وغیرہ ہے۔ حق گو انسان بے خوف و خطر اور نڈر ہوتا ہے، اس لئے وہ ڈٹ کر سچائی کا ساتھ دیتا ہے۔ وہ بادشاہ کے سامنے بھی حق بات کہنے سے نہیں ڈرتا۔ حق گو کو چاہیے کہ وہ حق بات اس طریقے اور حقانیت سے کہے کہ اس کے کہنے سے کوئی فتنہ پیدا ہونے کا خدشہ نہ ہو لیکن اگر بات مظلوم کا ساتھ دینے کی ہو تو ہمیشہ ڈٹ کر حق کا ساتھ دے۔ جہاں پر کسی کی تحقیر و تذلیل مقصود ہو وہاں حق گوئی اختیار کرنے سے گریز کرے۔ ہر وہ بات جو تجربہ، مشاہدہ اور دلائل کے ساتھ سچ ثابت ہو حق ہے۔ اس طرح ثابت و قائم شدہ اور اٹل بات حق ہے جبکہ اس کے مقابلے میں لفظ باطل ہے جس کا مطلب مٹ جانا، قائم نہ رہنا اور باقی نہ رہنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں سچائی و حق گوئی کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے:

"اور جو سچ لے کر تشریف لائے اور وہ جنہوں نے ان کی تصدیق کی یہی ڈر والے ہیں۔"(43)

ایک مومن کی نشانی یہ ہے کہ وہ حق بات کہے۔ کیونکہ اسلام میں بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیا گیا ہے۔ حق گو حقیقتاً بہادر شخص ہوتا ہے۔ اسے حق گوئی سے باز رکھنے کے لیے چاہے سولی پر چڑھا دیا جائے وہ پھر بھی حق گوئی سے باز نہیں آئے گا۔ ایسا انسان جو حق کے لیے جان دے وہ مر کر بھی ہمیشہ

دوسروں کے دلوں میں زندہ رہتا ہے۔ اس لیے حق گو اپنی اچھائی سے ہمیشہ دوسروں کے دلوں میں بلند مقام حاصل کرتا ہے۔ سیّد انصر بھی حق گو کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

سناں پہ سچ کے بھی سچائی کی گواہی دی
ہزار زندوں پہ بھاری رہے مرے ہوئے ہم(44)

حق گوئی کا متضاد بزدلی اور کمزوری ہے۔ اسلام میں بزدلی سے منع کیا گیا ہے۔ ہمیشہ حق کا ساتھ دینے والوں کو خوشخبری دی گئی ہے۔ بہادری اور شجاعت صرف بدن کی طاقت کا نام نہیں بلکہ اصل طاقت دل کی طاقت ہے۔ جس کا دل مضبوط ہو گا وہ حق گو ہو گا۔ حق گوئی کا تعلق ایمان کی مضبوطی سے ہے۔ انسان کا عقیدہ اسے مضبوط ایمان عطا کرتا ہے۔ جس کا ایمان مضبوط ہو گا اس کا دل مضبوط ہو گا۔ اس میں شجاعت اور بہادری کے جوہر موجود ہوں گے جو اسے کسی بھی باطل کے آگے جھکنے نہیں دیتے اور اس کے ایمان کو کمزور نہیں ہونے دیتے۔ اس طرح دل کی مضبوطی سے حق کے لیے جو آواز بلند ہوتی ہے، وہ حق گوئی ہے۔ اصل حق گوئی وہ ہے جب باطل طاقتور اور حق کمزور ہو یعنی کوئی اعلیٰ عہدیدار کسی کمزور کی حق تلفی کر رہا ہو یا اپنے کارندوں کے ذریعے کمزور اور ماتحت لوگوں کو دباتا ہو، ایسے مشکل وقت میں کسی کے سامنے نہ جھکنا اور حق کے لیے آواز بلند کرنا حق گوئی ہے۔ جس شخص کا ایمان کمزور ہو گا وہ کبھی حق کا مقابلہ نہیں کر سکتا بلکہ باطل کے آگے جھک جاتا ہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کی ایمانی طاقت ہی تھی کہ جس نے انہیں باطل کے خلاف ڈٹ جانے پر آمادہ کیا اور وہ ظلم سہہ کر بھی حق پر قائم رہے۔ ان کے ایمان نے انہیں باطل کے آگے جھکنے نہیں دیا۔ سیّد انصر بھی حضرت امام حسین علیہ السلام کی حق گوئی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

سر کشیدہ ہوں یزیدوں کے مقابل انصر
مجھ کو جھکنے نہیں دیتا میرے اندر کا حسین(45)

آج کل ہر کوئی حق گو کو دبانے کے چکر میں ہوتا ہے۔ حق گو کو اس کی سچائی پر مشکلات و مصائب میں دھکیلا جاتا ہے کہ وہ سچ بولنے سے گریز کرے اور جھوٹ کا ساتھ دے۔ یہ سب دین سے دوری کی بنا پر اور ایمان کی کمزوری کی وجہ سے ہے۔ ایمان کی کمزوری انسان کو خوفزدہ کرتی ہے کہ وہ سچ بولنے پر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا یا اسے کوئی مالی نقصان پہنچے گا جبکہ قوت ایمانی انسان کو یہ باور کراتی ہے کہ یہ جان صرف خدا کے لئے ہے۔ جینا اور مرنا سب اللہ کی ذات کے لئے ہے، عزت اور ذلت بھی خدا کے ہاتھ میں ہے۔ جو خدا مشکلات سے دوچار کرے گا وہی خدا مصیبتوں سے نکالنے کے اسباب بھی پیدا کرے گا۔ جان تو جانے والی چیز

ہے پھر کیوں نہ اسے بہادری سے حق کے لئے قربان کیا جائے۔ جب دل میں ایسی باتیں ہوں گی حق گو کو کسی قسم کا خوف حق گوئی سے باز نہیں رکھ سکے گا۔ اسے بعض اوقات سخت سزائیں بھی سہنی پڑتی ہیں لیکن وہ پھر بھی حق گوئی سے باز نہیں آتا۔ سیّد انصر حق گو کی مظلومیت یوں بیان کرتے ہیں:

ظلم کو ظلم کہا کرتے تھے
اس لیے لائق تعزیر تھے ہم(46)

بعض لوگ اتنے نرم دل اور بہادر ہوتے ہیں کہ وہ کسی پر ظلم برداشت نہیں کرسکتے اور نہ ہی وہ ظالم کے سامنے خاموش تماشائی بن سکتے ہیں۔ وہ نہ صرف خود پر ہونے والے ظلم پر آواز اٹھاتے ہیں بلکہ دوسروں پر ہونے والے ظلم کے خلاف بھی چپ نہیں رہ سکتے اور وہ مظلوموں کا ساتھ دیتے ہیں۔ ایسے شخص تاریخ کے بہادر نوجوان ہوتے ہیں۔ وہ کسی سے ڈرنے والے نہیں ہوتے بلکہ یہ دوسروں کے لئے بھی ہمت اور حوصلہ کا باعث ہوتے ہیں۔ ایسے بہادروں کو زبردست مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بعض اوقات معاشرہ انہیں باغی بھی قرار دیتا ہے اور انہیں لائق تعزیر سمجھتا ہے لیکن سچائی ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ حق گو کو اپنی اخلاقی اقدار، اپنے ایمان اور اپنی خودداری پر مکمل یقین ہوتا ہے۔ اس لیے وہ کسی بھی نقصان کی پرواہ کیے بغیر ہمیشہ سچ کا ساتھ دیتا ہے۔

میانہ روی:

میانہ روی فارسی زبان کا لفظ ہے۔ جس کو عربی میں اعتدال کہا جاتا ہے۔ میانہ روی کے لفظی معانی "درمیانہ روش یا چال" کے ہیں۔ یعنی زندگی کے تمام معاملات میں افراط و تفریط سے کام لینے کی بجائے درمیانی راہ اختیار کی جائے۔

زندگی کے تمام معاملات میں میانہ روی اختیار کرنے سے معمولات زندگی بہتر طریقے سے انجام پاتے ہیں اور زندگی پر سکون ہو جاتی ہے۔ یہ میانہ روی زندگی کے ہر معاملے میں اختیار کرنی چاہیے۔ اسلام میں بھی میانہ روی اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ فرض نماز کی ادائیگی کے ساتھ ایسی نفلی نمازیں ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو ذریعہ معاش میں رکاوٹ نہ بنیں۔ اسی طرح معمولات زندگی میں کھانے پینے اور سونے جاگنے میں اعتدال اختیار کرنے سے انسان کی صحت اچھی رہتی ہے۔ انسان مختلف بیماریوں سے بچا رہتا ہے۔ مناسب اور متوازن غذا انسان کو تندرست و توانا رکھتی ہے اور اسے مختلف بیماریوں کے خلاف لڑنے کی قوت عطا کرتی

ہے۔ اسی طرح کام کرتے ہوئے بھی اعتدال اختیار کیا جائے۔ کام کے دوران کچھ وقت آرام کے لئے مختص کیا جائے۔ اس سے جسم تھکان محسوس نہیں کرے گا بلکہ آرام کرنے سے کام کی تھکن اتر جائے گی۔ اسی لئے اللہ تعالی نے دن کو انسانوں کے کام کے لیے اور رات کو آرام کے لیے مخصوص کیا۔ رات بھر آرام کرنے سے جسم کو کام کرنے کی طاقت ملتی ہے۔

اسی طرح رشتوں میں بھی اعتدال سے کام لیا جائے۔ کسی کو اتنی زیادہ عزت مت دیں کہ وہ آپ کو حقیر سمجھنے لگے اور نہ ہی اتنی کم عزت دیں کہ وہ خود کو حقیر سمجھنے لگے۔ کوئی آپ کو جتنی اہمیت دے، اسی کے مطابق اسے اہمیت دی جائے۔ سیّد انصر رشتوں کو اس کے مقام پر رکھنے کے قائل ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

اگرچہ سینکڑوں سے دوستی کی
مگر جس کو جہاں رکھنا تھا رکھا(47)

انسان کو خرچ کرنے کے معاملے میں بھی میانہ روی اختیار کرنی چاہیے۔ آج کل مہنگائی کے اس دور میں اعتدال کی اشد ضرورت ہے۔ لوگ شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں بے جا رسم ورواج میں اسراف سے کام لیتے ہیں۔ اس طرح بہت سا پیسہ ان فضول رسموں میں ضائع کر دیتے ہیں۔ اس کے برعکس کچھ لوگ بہت کنجوس ہوتے ہیں وہ ضرورت کی چیزوں پر بھی پیسے خرچ نہیں کرتے۔ یعنی بیمار ہونے پر وہ علاج معالجہ بھی نہیں کرواتے کہ کہیں ان کے پیسے خرچ نہ ہو جائیں۔ اس طرح وہ ان پیسوں کو جمع کرتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگ بخل سے کام لیتے ہیں۔ اسلام میں بخل اور اسراف دونوں سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔ لہذا ان دونوں سے بچتے ہوئے درمیانی راہ اختیار کی جائے تاکہ انسان خوشحال زندگی گزار سکے۔

اس طرح خانگی معاملات میں بھی یہی رویہ اختیار کیا جائے کسی کا حق نہ مارا جائے۔ انصاف سے کام لیتے ہوئے حقدار کو اس کا حصہ انصاف سے دیا جائے۔ محبت اور نفرت دونوں میانہ روی میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ محبت میں میانہ روی رشتوں کو دیر تک ساتھ رکھتی ہے۔ اس سے کسی کی دل آزاری نہیں ہوتی۔ اگر کسی بات پر عداوت پیدا ہو جائے اور دو لوگ ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں تب بھی حسن سلوک کو ہاتھ سے نہ جانے دیا بلکہ میانہ روی اختیار کرتے ہوئے کوئی کسی کا حق نہ مارے۔ میانہ روی اختیار کرتے ہوئے انصاف سے کام لیا جائے۔ سیّد انصر اسے یوں بیان کرتے ہیں:

پہلے تو گھر کی ہر اک چیز کو انصاف سے بانٹ
اور پھر صحن میں دیوار سلیقے سے کر(48)

انسانی معاشرے میں محبت و پیار احساس سے پیدا ہوتا ہے۔ احساس نہ ہو تو یہ محبت ختم ہو جاتی ہے اور انسان میں ایثار و قربانی کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے سے جلد بدگمان ہو جاتے ہیں جس کے نتیجے میں وہ ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کو طنز و حقارت کا نشانہ بناتے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کی نفرت میں اس حد تک گر جاتے ہیں کہ نفرت کے اظہار کا کوئی لمحہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ایک دوسرے کو حقیر سمجھتے ہوئے طنزیہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔ ان میں صبر و تحمل ختم ہو جاتا ہے۔ اس طرح محبت اور نفرت دونوں میں میانہ روی اختیار کی جائے تو معاشرہ لڑائی جھگڑے سے بچ جائے گا لیکن اگر کھلم کھلا نفرت کا اظہار ہو گا تو نوبت قتل و غارت تک بھی جا سکتی ہے۔ اس لیے ہر کام میانہ روی سے کیا جائے۔ سیّد انصر میانہ روی کو سلیقے کا نام دیتے ہوئے کہتے ہیں:

ناگواری ہی سہی اظہار سلیقے سے کر
کار نفرت بھی میرے یار سلیقے سے کر(49)

اعتدال کی راہ رشتوں میں دراڑیں پیدا نہیں ہونے دیتی۔ میانہ روی سے انسان تمام رشتوں کو ساتھ لے کر چل سکتا ہے۔ اس سے کسی ایک کی بھی دل آزاری نہیں ہوتی۔ غرض کہ زندگی کے ہر معاملے میں میانہ روی دنیا و آخرت میں کامیابی کا سبب بنتی ہے۔

خودی:

خودی فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی خودداری، انا، عزت نفس، ضبط، تحمل اور غیرت مندی کے ہیں۔ یعنی اپنی خواہشات کو مار کر زندگی کو ایسے سانچے میں ڈھالنا جس سے اس کے کردار کی تعمیر ہو سکے خودی کہلاتا ہے۔ علامہ اقبال نے بھی اپنی شاعری میں خودی کا تصور پیش کیا۔ ان کا خودی کے بارے میں ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

خودی کا سر نہاں لا الہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الہ الا اللہ(50)

علامہ اقبال کے تصور خودی کے تین مراحل ہیں۔

1۔ اطاعت الٰہی

2۔ ضبط نفس

3۔ نیابت الٰہی

پہلے دونوں مراحل سے گزرنے کے بعد انسان نیابت الٰہی پر فائز ہو جاتا ہے اور یہ خودی کی اعلیٰ ترین سطح ہے۔ علامہ اقبال کا فلسفہ خودی یہ ہے کہ انسان اپنی نفسانی خواہشات کو ترک کر دے اور خدا کی بھیجی ہوئی تعلیمات پر عمل پیرا ہو۔ کلمہ طیبہ میں توحید و رسالت خودی کا بہترین درس ہے۔ اس میں صرف ایک خدا کے آگے جھکنے کا درس ہے۔ جب انسان خدا اور اس کے رسول کی تعلیمات پر عمل کرے گا تو وہ شیطان کے بہکاوے میں نہیں آئے گا۔ ایسا بندہ اللہ کے نیک بندوں میں شامل ہو جاتا ہے اسے اللہ تعالیٰ دنیا میں اپنا نائب مقرر کرتے ہیں اور اس کا مقصد خدا کے احکامات کو لاگو کرنا ہوتا ہے۔ ایسا شخص فقیرانہ زندگی بسر کرتا ہے۔ سیّد انصر نے بھی اپنی شاعری میں اسی فلسفہ خودی کو پیش کیا ہے:

ہم وہ فقیر لوگ ہیں موج میں آ گئے اگر
تخت کو لات مار دی بخت کو زیر کر دیا(51)

خودی میں انسان کسی کی غلامی پسند نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے اس لئے وہ آزاد زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ مومن شخص کسی کی غلامی میں نہیں رہتا۔ غلامی میں اسے بادشاہت بھی ملے تو وہ اسے لینا پسند نہیں کرتا۔ وہ اپنے ایمان کے بل بوتے پر دنیا فتح کرنا چاہتا ہے۔ غلامی میں ملی ہوئی بادشاہت کو وہ بڑے فخر سے ٹھکرا دیتا ہے اور اپنے ایمان پر قائم رہتا ہے۔ ڈاکٹر سیّد عابد سیال تصورِ خودی کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

"مخلوقات پر مدارجِ انسان اسی لئے سب سے برتر ہیں کہ اس کی ذات میں خودی کو اپنا اور اپنے مقصد کا شعور حاصل ہو جاتا ہے اور یہی شعور اسے اور سب چیزوں سے ممتاز کرتا ہے۔ انسان کو چاہئے کے اپنے مقام و مرتبہ کو پہچانے اور خود کو بے توقیر نہ کرے۔ یہی اعلیٰ ظرفی اور خودداری کا تقاضا بھی ہے۔"(52)

خوددار انسان کو اس کی انا کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے نہیں دیتی۔ خوددار شخص کتنی ہی مشکلات اور مسائل سے گزر رہا ہو وہ اپنی مشکلات کا تذکرہ کسی سے نہیں کرتا کہ لوگ اس پر ترس کھا کر اس سے ہمدردی نہ جتائیں۔ ایسے انسان کو ہمدردی یا ترس میں ملا ہوا ایک لفظ بھی پسند نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ صبر و تحمل سے ہر پریشانی کو برداشت کرتا ہے۔ وہ اپنی محنت اور کوشش سے ہی ان مشکلات سے نبرد آزما رہتا ہے۔ کسی سے مدد لینا اس کو گوارا نہیں ہوتا کیونکہ یہ اس کی خودی پر کاری ضرب ہے۔ خوددار شخص تحفتاً بھی کسی سے کچھ لینا

پسند نہیں کرتا کیونکہ وہ اس تحفے کے پیچھے چھپے مقصد کو اچھی طرح جان لیتا ہے۔ ایسا انسان خوشحالی میں بھی خدا کا شکر گزار ہوتا ہے اور مشکل میں بھی اس کے لبوں سے مسکراہٹ جدا نہیں ہوتی۔ اس کے چہرہ روشن اور دل مضبوط ہوتا ہے۔ وہ خدا پر بھروسہ رکھتے ہوئے ایمانداری سے کام کرتا ہے جس کا صلہ اسے معاشرے سے چاہے نہ ملے لیکن پھر بھی وہ ایمانداری کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ سیّد انصر بھی خودی کے بارے میں لکھتے ہیں:

فانوس کی حاجت نہیں خود داریوں کو
جب تک بھی جلے تیز ہوا ہی میں جلیں گے(53)

خودی بہترین صفات میں سے ایک صفت ہے جس سے انسان خود کو پہچانتا ہے، اپنے رب کو پہچانتا ہے۔ خودی ایک ایسا احساس ہے جو اگر مر جائے تو انسان کی غیرت مر جاتی ہے۔ پھر وہ بھیک میں ملی ہوئی ہر چیز دوسروں سے لے لیتا ہے چاہے وہ اُسے کتنی ہی حقارت سے پیش کی گئ ہو۔ جس انسان کی غیرت مر جائے اس کے پاس باقی کچھ نہیں بچتا۔ اس لیے اس کو اپنی تحقیر و ذلت بھی محسوس نہیں ہوتی۔ مومن غیرت مند ہوتا ہے اس کا ایمان اسے غیرت مند بناتا ہے۔ یہ مسلمانوں کی غیرت ایمانی کا ہی تقاضا تھا کہ مٹھی بھر مسلمانوں نے غزوۂ بدر میں کفار کی کثیر تعداد پر غلبہ پایا۔ بعد میں اسی خودی کے بل بوتے پر انہوں نے مکہ فتح کر لیا۔

خوددار انسان کو اپنی صلاحیتوں پر پورا اعتماد ہوتا ہے کہ خدا نے جو صلاحیت اسے ودیعت کی ہے وہ اسی کے بل بوتے پر کامیابی حاصل کرے گا۔ ایسے شخص کو خودی کے ساتھ خدا کی مدد بھی مل جاتی ہے جو اسے کسی کے آگے جھکنے نہیں دیتی۔ وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے محنت پر یقین رکھتا ہے۔ ایسا انسان خیرات میں ملی ہوئی ترقی بھی پسند نہیں کرتا بلکہ وہ اپنی محنت پر یقین رکھتے ہوئے خود ترقی کی منازل طے کرنا چاہتا ہے کیونکہ خیرات میں ملی ہوئی ترقی سے اس کی عزت نفس مجروح ہوتی ہے جو اس کی خودی پر ایک بھرپور طمانچہ ہے جس کی تپش اسے بار بار محسوس ہوتی ہے۔ اس لیے وہ کسی کی دی ہوئی چیزوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ لوگوں کی چیزوں سے بے نیاز رہنا اور کسی سے کچھ نہ مانگنا انسان کی عزت میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ اس طرح خودی انسان کو دوسرے کے آگے ہاتھ پھیلانے سے بچاتی ہے، انسان کا حوصلہ بڑھاتی ہے اور مخلوق سے ہٹ کر خدا کی طرف جانے کا راستہ بتاتی ہے۔ سیّد انصر خودی اختیار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

خیرات میں بخشی ہوئی صبحیں نہیں لوں گا
کافی ہیں مجھے رات، دیا، روشنی، آنکھیں(54)

یہ خودی ہر انسان میں ہونی چاہیے۔ انسان دوسروں کی دی ہوئی خیرات لینے کی بجائے اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ رکھے۔ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نہ صرف اپنے لیے روشنی پیدا کرے بلکہ دوسروں کے لیے بھی راہیں ہموار کرے۔

خوف:

خوف ایسا رویہ ہے جو کسی خطرے کے سبب ذہن میں آتا ہے۔ اس میں ماضی میں ہونے والے واقعات اور مستقبل میں کچھ غلط ہونے کی تشویش شامل ہوتی ہے۔ ماضی اور مستقبل کے وہم دونوں مل کر انسانی خوف کا سبب بنتے ہیں۔ کچھ خوف انسان کے اندر سے جنم لیتے ہیں اور کچھ بیرونی ماحول سے۔ جس معاشرے میں امن وسکون کی فضا نہ رہے، قتل وغارت، چوری، ڈکیتی اور دہشت گردی عام ہو جائے وہاں خوف کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ خوفزدہ انسان کے دماغ پر ہر وقت ڈر سوار رہتا ہے جو اس کی تخلیقی صلاحیتیں سلب کر لیتا ہے اور اسے معاشرے میں آگے بڑھنے سے روکتا ہے۔ اس طرح معاشرے میں تخلیقی صلاحیتیں پروان نہیں چڑھتیں۔ لوگ تحفظ کی سوچ ہی سے باہر نہیں نکل پاتے اور وہ مستقبل کی فکر کرنے کے بجائے اپنے تحفظ کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی اس سلسلہ میں کچھ یوں رقمطراز ہیں:

> "ادب، فن اور اس کی تخلیق ایک صحت مندانہ ماحول کا تقاضا کرتی ہے۔ وہ زندگی کی مثبت قدروں کی علمبردار ہوتی ہے۔ اس کا پودا صرف آزادی اور محبت کی فضا میں پنپتا اور پروان چڑھتا ہے۔"(55)

انسان مسلسل واہموں میں گھرا ہوا ہے۔ یہی واہمے خوف کا سبب بنتے ہیں۔ یہ وہم انسان کو بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کسی نہ کسی صورت میں اپنی لپیٹ میں لیے رکھتے ہیں۔ بچپن میں کسی کھلونے کے ٹوٹنے کا ڈر، کسی چیز کے چھن جانے کا خوف، خود کے گر جانے کا خوف وغیرہ۔ یہ خوف بچے کو مختلف واہموں میں مبتلا رکھتے ہیں جو اسے کھیلنے اور چلنے پھرنے سے روکتے ہیں۔ اس طرح یہ خوف بچوں میں بڑھنے اور پھلنے پھولنے کی صلاحیتیں چھین لیتے ہیں۔ جوانی میں بھی انسان پر مختلف قسم کے خوف لاحق ہوتے ہیں۔ مثلاً کچھ طالب علم امتحان میں بیٹھنے سے پہلے ہی ناکامی کے ڈر سے امتحان دینے کی ہمت نہیں کرتے۔ کچھ کھلاڑی کھیل میں ہار کے خوف سے حصہ نہیں لیتے۔

ایک کاروباری آدمی کاروبار کرنے سے پہلے فائدے کی بجائے نقصان کے بارے میں سوچتا ہے تو نقصان کا خوف اسے کاروبار کرنے نہیں دیتا۔ اس طرح ہار کا خوف لوگوں کو ترقی نہیں کرنے دیتا۔ اس طرح

بچپن سے لیکر بڑھاپے تک یہ خوف کسی نہ کسی صورت میں انسان کی زندگی میں قائم رہتا ہے اور اسے مکمل خوش بھی نہیں ہونے دیتا۔ کسی چیز کے چھن جانے کا خوف، کسی کی نوازشات کا خوف اور کسی کے دور جانے کا خوف وغیرہ کسی نہ کسی صورت میں انسانی زندگی میں موجود رہتے ہیں۔ محبتوں میں روٹھنے کے واہمے بھی لاحق ہوتے ہیں۔ محبتوں میں کسی کی ناراضگی کا خوف اور محبوب کی عزت کو کوئی غلط نگاہ سے نہ دیکھے۔ یہ خوف محب کو اظہار محبت سے روکے رکھتا ہے۔ عورت کی عزت پھول جیسی ہوتی ہے۔ جس پر ہوا کا گرم جھونکا بھی اسے مرجھا کر رکھ دیتا ہے۔ سیّد انصر اس کی نازک اندامی کو پھول سے تشبیہ دیتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:

اس ڈر سے کسی پھول کو چھو کر نہیں دیکھا
پاکیزگی حسن پہ الزام نہ آئے(56)

یہ خوف انسان سے دوسروں کا احساس چھین لیتا ہے۔ خوف زدہ انسان اپنے خوف میں مبتلا ہو کر دوسروں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ یہ خوف انسان کی نس نس میں سما جاتا ہے اور اس کی صلاحیتوں کو مفلوج کر دیتا ہے۔ اسی خوف کے سبب انسان اندیشوں اور واہموں میں گھرا رہتا ہے۔ کچھ غلط ہو جانے کا ڈر ہر وقت اس کے دماغ میں سوار رہتا ہے جو اسے مسلسل پریشان رکھتا ہے۔

خوف ڈرپوک لوگوں پر زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ وہ ان لوگوں کو اپنے قابو میں کر لیتا ہے جبکہ نڈر لوگوں پر یہ خوف اثر نہیں کر پاتا اور نڈر لوگ اس پر قابو پا لیتے ہیں۔ کمزور لوگ اس خوف کی وجہ سے مزید کمزور ہو جاتے ہیں۔ خوف کی وجہ سے لوگ کسی کام کے لیے کوشش نہیں کر پاتے اور کامیابی سے پہلے ہی ناکام ہو جاتے ہیں۔ بعض لوگ خوف اور خطرے کو مترادف سمجھتے ہیں جبکہ خوف اور خطرے میں یہ فرق ہے کہ خوف خیالی ہوتا ہے جبکہ خطرہ حقیقی ہوتا ہے۔ خوف کسی کام کے لیے کوشش کرنے ہی نہیں دیتا جبکہ خطرہ انسان کو اس کام میں درپیش مشکلات سے آگاہ کرتا ہے تاکہ انسان بروقت کوئی حل تلاش کر سکے۔ خوف ترقی کی طرف جانے ہی نہیں دیتا جبکہ خطرہ انسان کو ترقی کی راہ دکھاتا ہے۔ اس طرح خوف انسانی ترقی کی سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتا ہے۔

خوف ہمارے تصور میں ہوتا ہے کہ اگر ایسا ہو گیا تو کیا ہو گا۔ یہ صرف دنیا کی محبت میں ہوتا ہے۔ اگر دنیا کی محبت ختم ہو جائے تو انسان ہر خوف سے آزاد ہو جاتا ہے۔ دنیا کی محبت اسے کسی چیز کے چھن جانے کے خوف میں مبتلا رکھتی ہے اور اس کا سکھ چین اور راتوں کی نیندیں چھین لیتی ہے۔ خوف کسی بھی صورت میں

انسان کو سکون نہیں لینے دیتا۔ ایک نارمل انسان خوف کے زیر اثر ابنارمل لگتا ہے۔ شعرا معاشرے کا حساس طبقہ ہیں اس لئے وہ ہر احساس سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ سید انصر بھی خوف سے متاثر ہوتے ہوئے لکھتے ہیں:

اس خوف سے جاگتا ہوں شب بھر
سو جائیں نہ پہرے دار میرے(57)

اس خوف پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ اس خوف پر قابو پانے کے لیے سب سے اہم یہ ہے کہ انسانی خوف کو ختم کر کے اسے خوف خدا میں بدل دیا جائے۔ جب یہ ڈر خوف خدا میں بدل جائے تو انسان کی ساری پریشانیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ خشیت الٰہی ایسا خوف ہے جو انسان کو خدا کے مزید قریب لے جاتا ہے اور جو انسان خدا کے قریب ہو جاتا ہے خدا اس کی خود حفاظت کرتا ہے۔ جو صرف خدا سے ڈرتا ہے خدا اسے اپنی مخلوقات سے نقصان نہیں پہنچنے دیتا۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو برابر کی طاقت عطا کی ہے جبکہ دوسری مخلوقات کی نسبت انسان کی طاقت زیادہ ہے۔ اس لئے انسان کو اشرف المخلوقات پیدا کیا گیا ہے۔ انسان اپنی طاقت کو استعمال کرتے ہوئے دوسری مخلوقات پر قابو پا سکتا ہے۔ انسان اپنی طاقت کے بل بوتے پر ہی دوسری مخلوقات کو تسخیر کر سکتا ہے۔ لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ انسان کے اندر سے باقی تمام خوف ختم ہو جائیں اور صرف خدا کا خوف باقی رہے۔ خوف خدا انسان کو خدا کے قریب لے آتا ہے اور اسے خدا کی محبت عطا کرتا ہے۔ جس سے انسان کو نقصان کی بجائے کامیابی ملتی ہے۔

غرور و تکبر:

تکبر کے معانی بڑائی، گھمنڈ، فخر، غرور اور انا کے ہیں۔ اپنی ذات کو برتر اور دوسروں کو کمتر سمجھنا تکبر کہلاتا ہے۔ تکبر شیطانی صفت ہے۔ سب سے پہلے کیا جانے والا گناہ تکبر ہی تھا جس نے فرشتے کی نورانیت کو شیطانیت میں بدل دیا۔ ابلیس کا حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار تکبر کے سبب ہی تھا۔ اس نے خود کو حضرت آدم علیہ السلام سے اعلیٰ سمجھا کیونکہ حضرت آدم کو مٹی سے پیدا کیا گیا تھا اور ابلیس کو آگ سے۔ یہ خدا کی سب سے زیادہ عبادت کرنے والا فرشتہ تھا۔ اس لیے اس نے اپنی عبادت پر تکبر کیا اور تعظیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے زیادہ تکبر کو ناپسندیدہ فعل قرار دیا ہے۔ اس تکبر کی وجہ سے بڑے بڑے بادشاہ ذلیل و خوار ہوئے ہیں۔ تکبر کرنے والے انسان کو رسوائی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔

تکبر مختلف صورتوں میں انسانوں میں پایا جاتا ہے۔ جن میں حسب و نسب، مال و دولت، کثرت اولاد، خوبصورتی اور تقویٰ و دینداری کا تکبر وغیرہ شامل ہیں۔ تکبر کی کوئی بھی صورت ہو ہر طرح سے ناپسندیدہ ہے۔ بہت سے انسان ذات پات کے چکر میں خود کو بہترین تصور کرتے ہیں اور خود کو اعلی و ارفع خاندان سے منسوب کرتے ہیں جبکہ دوسروں کو اپنے سے کمتر سمجھتے ہیں۔ ذات پات کا یہ تصور ہندوؤں میں پایا جاتا تھا۔ انہوں نے اپنے آپ کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہوا تھا برہمن اور شودر۔ برہمن اعلیٰ ذات تھی جب کہ شودر ادنی۔ برہمن شودروں سے نفرت کرتے تھے اور ان کو چھوت سمجھتے تھے۔ مسلمانوں میں بھی کچھ ایسے خاندان پائے جاتے ہیں جن میں حسب و نسب کا تکبر پایا جاتا ہے۔

جاگیر دار لوگ خود کو اعلیٰ اور خاندانی سمجھتے ہیں جبکہ مزدور طبقے کو حقیر اور کمتر خیال کرتے ہیں جو صرف ان کی خدمت کے لیے ہی پیدا کیے گئے ہیں۔ وہ اپنے حسب و نسب کے چکر میں خور کو نسلی اور خاندانی کہتے ہیں جبکہ دوسرے لوگوں کو حقارت سے غیر نسلی اور غیر خاندانی جیسے القابات سے نوازتے ہیں۔ ان کی نفرت کا یہ عالم ہے کہ وہ کسی ایسی ذات میں رشتہ کرنا پسند نہیں کرتے جو ان کی ہم پلہ نہ ہو۔ حالانکہ خدا کے نزدیک سب انسان برابر ہیں۔ سب نے مر کر ایک ہی مٹی میں جانا ہے۔ یہ حسب و نسب سب کچھ فانی ہے۔ سب نے فنا ہو کر اللہ کی طرف جانا ہے تو پھر اس فانی دنیا پر کس بات کا غرور جو انسان کو آزمائش کے لیے دی گئی ہے۔ سیّد انصر انسان کے غرور پر لکھتے ہیں:

اے بشر تو فنا کا پتلا ہے
پھر ترا ہونا کیا نہ ہونا کیا(58)

کچھ لوگوں کو کثیر تعداد میں مال و دولت سے نوازا جاتا ہے۔ تاکہ خدا ان کی آزمائش کر سکے کہ وہ خدا کی شکر گزاری کرتے ہیں یا ناشکری۔ مغرور انسان اس پر شکر ادا کرنے کی بجائے اس مال کو اپنا حق سمجھتے ہوئے غرور و تکبر میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ غریبوں میں مال تقسیم کرنے کی بجائے ان کا حق بھی چھین لیتے ہیں تاکہ اپنے مال میں اضافہ کر سکیں۔ ایسے لوگ مال و دولت کی زیادتی سے خود کو اعلی و برتر سمجھتے ہیں۔ غریبوں اور ملازموں سے حقیرانہ سلوک کرتے ہیں۔ کچھ جاگیر دار تو غریبوں کو کسی صورت اپنے سے آگے نہیں بڑھنے دیتے۔ ان کو اپنا غلام بنا کر رکھتے ہیں اور ان پر تعلیم کے دروازے بھی بند کر دیتے ہیں تاکہ کہیں یہ لوگ ان کے برابر نہ آ کھڑے ہوں۔ یہ اپنے غرور و تکبر میں فرعونیت پر اتر آتے ہیں اور غریبوں پر ظلم و جبر کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔

کچھ لوگوں کو بیٹے ہونے کا تکبر ہوتا ہے اور جن کے پاس اولاد نہیں ہوتی یا بیٹیاں ہوتی ہیں انہیں حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں کہ جیسے اولاد پیدا کرنا ان کے اپنے اختیار میں تھا۔ وہ دوسروں کو بیٹی ہونے یا اولاد نہ ہونے کے طعنے دیتے ہیں۔ لیکن ان کا غرور و تکبر انہیں لے ڈوبتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا شکر ادا کرنے کے بجائے وہ دوسروں کو حقیرانہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔ سیّد انصر ایسے لوگوں کو نادان کہتے ہیں جن کے پاس سب کچھ ہوتا ہے اور وہ اس پر شکر کرنے کی بجائے غرور و تکبر میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ انہیں یہ مال و دولت اور اولاد سب آزمائش کے لیے دیا گیا ہے۔ وہ مغرور لوگوں کی نادانی پر لکھتے ہیں:

ایسے نادان آدمی کچھ ہیں
جو یہ کہتے ہیں ہم سبھی کچھ ہیں(59)

کچھ انسانوں کو اپنے حسن پر بہت ناز ہوتا ہے۔ ان کو اپنا قد کاٹھ، گورا رنگ اور تیکھے نین نقوش بہت پرکشش دکھائی دیتے ہیں۔ جس کی بنا پر وہ خود کو خوبصورت اور دوسرے لوگوں کو بدصورت سمجھتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے سب کو خوبصورت پیدا کیا ہے۔ اپنے حسن پر نازاں لوگ دوسروں کو بدصورت اور بدشکل جیسے القابات سے نوازتے ہیں۔ یہ حسن پرست لوگ دوسروں سے دوستی کرنا تو دور ان سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے۔ ان کی ظاہری خوبصورتی انہیں غرور تکبر میں مبتلا کر دیتی ہے۔ انہیں اپنے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ان کے لئے خوبصورتی ہی سب کچھ ہوتی ہے۔ وہ اپنی خوبصورتی سے ساری دنیا حاصل کر لینا چاہتے ہیں۔ ان کے لیے چاہت، مروت اور خلوص کچھ معنی نہیں رکھتے بلکہ ان کو یہ گمان ہوتا ہے کہ ہر کسی کی محبت پر صرف ان کا حق ہے۔ اس طرح وہ دوسروں کی حق تلفی کرتے ہیں اور بعض اوقات حاسد بھی بن جاتے ہیں۔ بہت سے لوگ ان کی ظاہری خوبصورتی کو دیکھ کر ان سے متاثر ہوتے ہیں اس لیے ان میں غرور و گھمنڈ پیدا ہو جاتا ہے جو انہیں کسی کی سچی محبت بھی قبول نہیں کرنے دیتا۔

حسن پرستوں کو اپنے جیسے حسین لوگ ہی پسند آتے ہیں اور معمولی شکل و صورت کو وہ اپنے تکبر سے بدشکل خیال کرتے ہیں۔ ان کا تکبر ان کے دل میں دوسروں کے لیے موجود احساس کو ختم کر دیتا ہے۔ ایسے لوگ دوسروں کا اپنے لیے پیار دیکھ کر ان کا مذاق اڑاتے ہیں اور ان کے خلوص اور محبت کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ ان کو بھی دوسروں کی بیرونی خوبصورتی ہی پرکشش دکھائی دیتی ہے۔ سیّد انصر محب کی اس کے محبوب سے محبت کے بارے میں لکھتے ہیں:

تمہارا زعم محبت بجا سہی انصر
مگر وہ شخص بھی مغرور انتہا کا ہے(60)

مغرور شخص پر جتنی محبتیں بھی نچھاور کر لیں اس کا خود پسند رویہ اسے کسی کا نہیں ہونے دیتا۔ اسے خوبصورت چہروں ہی سے محبت ہوتی ہے جو اس کی بربادی کا ساماں پیدا کرتی ہے۔

کسی سفید کو کالے پر اور کسی کالے کو سفید پر، عجمی کو عربی پر اور عربی کو عجمی پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ اگر کسی انسان کو کسی پر فوقیت حاصل ہے تو وہ صرف تقویٰ کی بنیاد پر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہی پسندیدہ شخص ہے جس میں عاجزی پائی جاتی ہے۔ تکبر کرنے والا انسان دنیا میں بھی ذلیل و خوار ہوتا ہے اور آخرت میں بھی اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

امرا کی غفلت:

غفلت کا مطلب بے خبر، بے ہوش، لاعلم، غافل، بے فکر، بے پرواہ، غیر متوجہ اور سویا ہوا ہے۔ غفلت ایسی کیفیت کا نام ہے جس میں کوئی بھی انسان کسی بھی کام، سوچ اور دوسروں کے احساس سے غافل ہو جاتا ہے۔ دوسروں کی فکر سے بالکل لاپرواہ اور آزاد ہو جاتا ہے۔ غفلت انسانی دل کے لئے سخت نقصان کا باعث ہے۔ غفلت دلوں کی ویرانی اور بربادی کا نام ہے۔ غافل انسان کا دل سخت ہو جاتا ہے اور اسے اپنے علاوہ کسی کی پرواہ نہیں ہوتی۔ جب غفلت دل پر غالب آجاتی ہے تو یہ مضبوط ہو جاتی ہے اور دل کو مردہ اور ویران کر دیتی ہے۔ دل کی زمین کو بنجر و خشک کر دیتی ہے۔ بنجر زمین پر جس طرح کوئی پھول نہیں اگ سکتا۔ اسی طرح پتھر دل پر احساس کی کرنیں نہیں پھوٹ سکتیں۔ غفلت شعار دل دنیا کی محبت میں غرق ہو جاتا ہے اور آخرت کو بھلا دیتا ہے۔ وہ نفسانی خواہشات کے پیچھے ہی لگا رہتا ہے اور اپنے جسم کو انہی کاموں کے لیے تھکا دیتا ہے۔ امیر لوگ اپنی دولت کے نشے میں غریبوں کی مجبوری، ان کی تکالیف اور درد سے بے نیاز ہوتے ہیں کیونکہ وہ ان میں جا کر ان کا حال پوچھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ آج کل صرف امرا ہی نہیں بلکہ علما اور نیک لوگ بھی دین سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ بھی دین کو چھوڑ کر دنیا میں مگن ہو گئے ہیں اور اپنے فرائض سے غافل ہوتے جا رہے ہیں۔ سیّد انصر اپنی شاعری میں اسے یوں بیان کرتے ہیں:

رئیس شہر تو غفلت شعار تھا سو تھا
فقیہ و شیخ بھی منبر پہ سوئے بیٹھے ہیں(61)

نادار و مفلس لوگ جن کے بارے میں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے باز پرس ہو گی شہر کے امر ا ان سے لاپرواہی برت رہے ہیں۔ ان کے علاج معالجے، کھانے پینے، رہائش اور بنیادی ضروریات کی کسی کو پروا نہیں ہے۔ کچھ غریب لوگ تو محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتے ہیں لیکن کچھ لوگ بھوک و افلاس سے تنگ آ کر بھیک مانگنا شروع کر دیتے ہیں یا خود کشی کر لیتے ہیں۔ مہنگائی کی ساری پریشانیاں بھی صرف غریب عوام کے لیے ہیں جن کی بنیادی ضروریات بھی پوری نہیں ہوتیں اور وہ ایک وقت کی روٹی کھا کر دوسرے وقت کی روٹی کے لیے سوچ میں پڑ جاتے ہیں. جن کے پاس بچوں کی سکول فیس کے لیے پیسے نہیں ہوتے کہ وہ اپنے بچوں کو پڑھا لکھا کر اچھا انسان بنا سکیں۔

امرا کو اپنی عیش پرستی سے ہی فرصت نہیں۔ ان کے پاس اے سی لگے کمرے اور گاڑیاں ہیں جن سے وہ باہر نکلنا بھی گوارا نہیں کرتے کہ وہ دھوپ میں جھلستے غربا کی بے بسی و مفلسی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔ بھوک سے بلکتے ہوئے بچوں کی آہ وزاری سن سکیں اور ان کے لیے کچھ کر سکیں۔ علما وفقہا قوم کو دینی تعلیمات سے جھنجھوڑ سکتے ہیں لیکن وہ بھی اس بارے میں خاموش ہیں۔ ان کے قلم غریبوں کی بے بسی پر خاموش ہیں۔ اگر زکوٰۃ کا نظام مستقل فعال کر دیا جائے تو معاشرے کے غریب بھی پیٹ بھر کر کھانا کھا سکتے ہیں۔ زکوٰۃ امیروں سے وصول کر کے غریبوں میں دی جائے تو بہت سے غربا کی مشکلات حل ہو سکتی ہیں۔ زکوۃ سے غربا کو بہترین روزگار میسر آ سکتا ہے۔ اس سے ملک کا معاشی نظام بہتر ہو جاتا ہے اور معاشرے میں محبت کی فضا قائم ہو جاتی ہے۔ سیّد انصر امرا کی غفلت پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

محلوں سے نکل کے کون دیکھے
یہ اجڑے ہوئے دیار میرے(62)

جہاں پر بھوک و افلاس ڈیرہ جمالیتی ہے وہ شہر کے شہر تباہ ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کی ایک دوسرے سے غفلت بہت سے لوگوں کو موت کے دہانے تک لے جاتی ہے۔ غریبوں کی کسمپرسی کے بارے میں سوچنے والے ان کی طرف آنکھیں بند کر کے اپنی زندگی میں مصروف ہیں۔ انہیں اپنی خود نمائی سے ہی فرصت نہیں ملتی اور غریب کی زندگی کو قریب سے دیکھنا ان کے لیے ناگوار ہوتا ہے۔ جو بھی حکمران یا امیر شہر ہو وہ خود عیش پرستی میں رہتا ہے اور قوانین سارے غریب پر لاگو ہوتے ہیں کیونکہ ٹیکس سارا غریب سے وصول کیا جاتا ہے۔ غریب کی غربت انہیں اس موڑ پر لا کھڑا کرتی ہے کہ وہ اپنی قیمتی چیز بیچ کر اپنی بھوک مٹانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں تاکہ انہیں اور ان کے بچوں کو دو وقت کی روٹی میسر آ سکے۔ انہیں کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا

پڑے۔ امرا ان کی مجبوری سے یا تو مکمل طور پر غفلت اپناتے ہیں یا پھر ان کی مجبوری سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ سیّد انصر غیور غربا کی غیرت پر لکھتے ہیں:

غیور لوگ تھے جب بھوک سے نڈھال ہوئے
تو گھر کا قیمتی سامان بیچنے آئے(63)

اس غفلت شعاری سے معاشرے میں بد نظمی پیدا ہو جاتی ہے۔ معاشرتی استحصال سے معاشرے تباہ ہو جاتے ہیں۔ امرا اپنی امارت کے نشے میں غریبوں کا استحصال کرتے ہیں۔ ان کی مدد کرنے کی بجائے ان کے حقوق پر قبضہ کرتے ہیں اور ان کی املاک پر قبضہ کر کے انہیں پریشان حال چھوڑ دیتے ہیں۔ جو انسان دوسروں سے لاپرواہ ہو جاتا ہے اس کی حالت مردوں جیسی ہو جاتی ہے جن پر کوئی آواز، کوئی احساس اور کوئی جذبہ اثر نہیں کرتا۔ ان کے دل میں دوسرے کے لئے ہمدردی جیسے جذبات ختم ہو جاتے ہیں۔ پھر ان کا کسی کے لئے ہونا یا نہ ہونا برابر ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ کسی کو فائدہ نہیں پہنچا سکتے بلکہ الٹا نقصان کا باعث بنتے ہیں۔ یہ لوگ دور سے تو بہت اچھے دکھائی دیتے ہیں۔ انہیں قریب سے دیکھ کر ان کی باتیں سن کر دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ احساس سے مرے ہوئے لوگ ہیں جن کے دل میں دوسروں کے لئے کوئی درد بھرا احساس موجود نہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں سیّد انصر لکھتے ہیں:

کبھی قریب تو آ، حال پوچھ، چھو کر دیکھ
جنہیں تو زندہ سمجھتا ہے موئے بیٹھے ہیں(64)

غفلت سے انسان دوسروں کے ساتھ اپنا بھی نقصان کرتا ہے۔ یہ غفلت انسان کو دنیا میں اکیلا کر دیتی ہے۔ جو دوسروں کا احساس نہیں کرتے دوسرے لوگ بھی ان کا احساس کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔

رازداری:

رازداری کا مطلب ہے خاموش رہنا، چپ رہنا، کچھ نہ کہنا، کسی بات یا عمل کو پوشیدہ رکھنا وغیرہ۔ ہر انسان اپنے سینے میں کوئی نہ کوئی راز چھپا کر رکھتا ہے۔ جسے بعض اوقات کسی مصلحت کے تحت وہ کسی سے بیان نہیں کرتا۔ کوئی ایسا جرم یا عمل جسے وہ دوسروں سے چھپا کر رکھنا چاہتا ہے رازداری کہلاتا ہے۔

رازدار اپنی عزت کے لیے دوسروں سے اپنی باتیں پوشیدہ رکھتا ہے۔ تاکہ دوسرے لوگ اسے عزت کی نگاہ سے دیکھیں۔ نفرت و حقارت سے بچنے کے لیے انسان اپنے عیب یا گناہ دوسروں سے مخفی رکھتا ہے۔ کچھ

گناہ انسان دوسروں سے چھپ کر کرتا ہے جسے وہ دوسروں کے سامنے عیاں نہیں کر سکتا۔ انسان کے لیے ضروری ہے وہ دوسرے کا راز جاننے کے بعد اس کی پردہ پوشی کرے۔ اللہ تعالیٰ انسان کے گناہوں کی مسلسل پردہ پوشی کر رہا ہے، وہ سب کچھ دیکھنے اور جاننے والا ہے، وہ چاہے تو سب کے راز افشاں کر دے لیکن جب خدا نے لوگوں کا پردہ رکھا ہوا ہے تو انسانوں کو بھی چاہیے دوسروں کی پردہ پوشی کریں۔ لوگوں کو چاہیے کہ کسی کے عیب جاننے کی غرض سے ان کی ٹوہ میں نہ لگے رہیں۔ کسی کے اندر کی بات جاننے کی کوشش نہ کی جائے بلکہ جو بات بتائی جائے اسی پر اکتفا کیا جائے۔ اگر انسانوں کے راز سے پردہ اٹھ جائے تو کوئی کسی کی صورت نہیں دیکھنا چاہے گا، دنیا سے محبت ختم ہو جائے گی، لوگ ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگیں گے اور دنیا میں صرف نفرت اور بغض رہ جائے گا۔ انسان اگر جھوٹ بول کر کوئی بات چھپا رہا ہو تو اس کی آنکھیں ظاہر کر دیتی ہیں کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ انسانی آنکھیں انسان کے اندر کی کیفیت بیان کر دیتی ہیں۔ سیّد انصر بھی رازداری کی تلقین کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

دیکھ انصر یہ روش ٹھیک نہیں

ہر کسی کی نہ پڑھا کر آنکھیں(65)

یہ دنیا غموں سے بھری پڑی ہے۔ دنیا میں غم اور خوشی دونوں قسم کے جذبات پائے جاتے ہیں بلکہ غم کی مدت خوشی سے زیادہ ہوتی ہے۔ انسان اگر ہر وقت اپنے چہرے پر غموں کو سجائے رکھے گا تو لوگ اس سے اکتاہٹ محسوس کریں گے۔ سب کو ہنستے مسکراتے چہرے ہی اچھے لگتے ہیں۔ خوشی کے لمحات میں سب ساتھ ہوتے ہیں لیکن غم میں انسان اکثر تنہا رہ جاتا ہے اور سب ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ اس لئے بہت سے لوگ اکثر اپنے غموں کو سینے میں چھپا کر چہرے پر مسکراہٹ لئے دوسروں سے ملتے ہیں تاکہ کوئی ان کے غموں کو جان نہ لے۔ ایسے لوگ بڑے بڑے راز سینے میں چھپا لیتے ہیں۔ وہ اپنی محبت بھی دوسروں سے چھپا کر رکھتے ہیں اور محبتوں میں ملے غم بھی دوسروں سے چھپاتے ہیں تاکہ ان کے محبوب کی رسوائی نہ ہو۔ سیّد انصر اسے اپنی شاعری میں یوں بیان کرتے ہیں:

زمانے سے نہاں رکھنا تھا رکھا

تمہارا غم جہاں رکھنا تھا رکھا(66)

انسان کا اپنا دل سب سے بڑا رازدار ہے۔ اس لیے انسان کو اپنا راز اپنے سینے میں ہی چھپا کر رکھنا چاہیے۔ اسے اپنے اسرار و رموز کی خود ہی حفاظت کرنی چاہیے۔ راز اس وقت تک راز ہے جب تک آپ کے

سینے میں ہے تب تک آپ اس کے آقا ہیں۔ لیکن جب یہ راز کسی اور کے سینے میں منتقل ہو جاتا ہے تو آپ اس راز کے غلام ہو جاتے ہیں۔ اگر انسان کو اللہ تعالی نے کسی نعمت سے نوازا ہے تو اسے چاہیے کہ جہاں پر بغض و حسد کا اندیشہ ہو وہاں پر اپنی نعمتوں کو افشا نہ کرے بلکہ ان نعمتوں کو چھپانے کی کوشش کرے۔

اس طرح دوسروں کو بھی چاہیے کہ اگر کسی کے پاس اس کا راز ہے تو وہ چاہے اس کے گھر، اس کی ذاتی برائی، عیب اور نقص سے متعلق ہو کسی سے بھی اس کا راز بیان نہ کرے بلکہ لوگوں کے سامنے اس کی پردہ پوشی کرے۔ کیونکہ جو دوسروں کی پردہ پوشی کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی کرے گا۔ اسی طرح دوسروں کے ساتھ بھلائی کرنے والا بھی ہمیشہ بھلائی میں رہتا ہے۔ دوسروں کے راز کے ساتھ ساتھ اپنے راز کو بھی سینے میں چھپا کر رکھنے کی کوشش کریں۔ جب آپ خود راز نہیں رکھ سکتے تو دوسروں سے بھی اس راز گوئی کی توقع نہ کریں۔ آپ سے زیادہ آپ کے راز کی حفاظت کوئی نہیں کر سکتا۔ سیّد انصر راز کی حفاظت کے بارے میں لکھتے ہیں:

ڈھونڈے ہے جسے وسعت افلاک میں دنیا
وہ راز میرے سینے میں دفنایا ہوا ہے(67)

راز ایک ایک امانت ہے جس میں خیانت کرنا گناہ ہے۔ کوئی شخص بہت اعتبار کر کے آپ کو اپنے راز میں شامل کرتا ہے تو آپ پر ضروری ہو جاتا ہے کہ اس کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچائیں۔ کسی کا راز افشا کرنا دوسروں کی عزت اچھالنا ہے۔ جو لوگ دوسروں کی عزت اچھالتے ہیں ان کی اپنی عزت بھی محفوظ نہیں رہتی اور دوسروں کو ذلیل و رسوا کرنے والا خود بھی ذلیل و رسوا ہوتا ہے۔ لیکن ایسا آدمی جس کا شر دوسرے لوگوں اور معاشرے کے لئے نقصان کا باعث ہو تو ایسے شخص کے راز افشا کرنے میں کوئی حرج نہیں تاکہ معاشرے کو اس کی شر انگیزی سے بچایا جا سکے۔ سیّد انصر نے رازداری کو اپنی شاعری میں پرو کر اسے عمدہ اخلاقی رنگ دیا ہے۔ جس کو اختیار کرنا اچھے انسان کی خوبیوں میں شامل ہے۔

کلاسیکی شاعری میں عشق کا بہترین انداز عشق حقیقی ہے جس میں یہ تصور پایا جاتا ہے کہ اگر دل میں درد اور سوز و گداز نہ ہو تو خدا تک رسائی ناممکن ہے اور خدا دل میں نہیں سما سکتا جس کی وجہ سے درد و غم اور سوز و گداز کو غزل کا حصہ مانا جاتا ہے۔ معاشرتی تبدیلیوں کی بنا پر ان تصورات میں بھی تبدیلیاں آتی گئیں اور ترقی پسند دور میں غزل کا عاشق بد نصیبی اور درد و گداز کو چھوڑ کر بغاوت اور انقلاب کی طرف مائل ہو گیا۔ ترقی پسند اور جدید غزل گو شعرا کے کلام میں اس پرانے شاعرانہ تصور میں تبدیلی پیش عمل ہوتی ہوئی نظر آتی

ہے۔ سیّد انصر کا شمار بھی ان جدید غزل گو شعرا میں ہوتا ہے جنہوں نے معاشرتی افکار کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ ہر شاعر کا اپنا ایک مخصوص نظریہ اور انداز فکر ہوتا ہے جس سے وہ اپنی شاعری کے ذریعے قوم و ملت کو ایک خاص سوچ اور فلسفہ عطا کرتا ہے۔ اس ضمن میں سیّد انصر اپنے موضوعات کے حوالے سے اپنے کلام کی عظمت پر نازاں اور خوش ہیں کیونکہ انہوں نے اپنی شاعری سے اردو ادب کو بہت کچھ دینے کی کوشش کی ہے۔

اس باب میں ان کے شعری مجموعہ "برسوں بعد" کے فکری عناصر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ ان کی شاعری کی دوسری تخلیق ہے۔ ان کا یہ شعری مجموعہ 2006ء میں منظر عام پر آیا۔ جو حمد و نعت اور سلام کے علاوہ 55 غزلیات پر مشتمل ہے۔ اس کا انتساب انہوں نے "محسن انسانیت" کے نام کیا ہے۔ اس میں انہوں نے مختلف معاشرتی و سیاسی موضوعات کو شاعرانہ رنگ دیا ہے۔ انہوں نے غم جاناں جیسے موضوعات سے ہٹ کر معاشرتی مسائل، انسانی ضروریات، رنج و الم، اتباعِ خدا اور رسولؐ، جبر و قدر، نوحہ کربلا اور بغض و عداوت جیسے عناصر کو اپنی شاعری کا حصہ بنا کر جدید شاعری کے طرز کو اختیار کیا ہے اور اپنے کلام میں مثبت روایات کو شامل کر کے غزل سے منفی اور گھٹیا رجحانات کی تردید کی ہے۔ انہوں نے کربلا کے استعاروں کا استعمال کرتے ہوئے ان کی بہادری اور جرات مندی کو یوں بیان کیا ہے کہ پڑھتے ہوئے قارئین کے دل میں بھی جوش و جذبہ کی ایک لہر ابھرتی ہے۔ وہ انسانی کاوشوں کو نیا آہنگ دیتے ہوئے ہمیشہ پر امید رہنے کی تلقین کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی شاعری سچائی اور حقیقتوں کی متلاشی ہے۔ وہ جھوٹ اور باطل سے نفرت کا اظہار کرتے ہوئے دھوکہ دہی کے نقصانات کو بھی شعری سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ ان کی شاعری انفرادی بھلائی کی بجائے اجتماعی بھلائی کو فروغ دیتی ہے۔ وہ ملک کے سیاسی نظام سے متنفر نظر آتے ہیں جس میں حکمران طبقہ آزاد اور خوشحال جبکہ عوامی طبقہ غربت کی چکی میں پس رہا ہے۔ وہ معاشرے کی زبوں حالی پر افسردہ دکھائی دیتے ہیں۔

زیر نظر مجموعہ "برسوں بعد" میں انہوں نے وحدانیت، اتباع رسول، جبر و قدر کا تصور، خیر خواہی، گمان، اداسی، شکوہ، ریاکاری، آلام و مصائب، حق گوئی، میانہ روی، خودی، خوف، غرور و تکبر اور رازداری جیسے موضوعات پر بحث کی ہے۔ ان کی شاعری میں زندگی کے تمام رنگ خوبصورتی سے جھلکتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنی داخلی کیفیات کے ساتھ ساتھ خارجی زندگی کے تلخ و شیریں حقائق کو اس قرینے سے تخلیقی تجربے کا حصہ بناتے ہیں کہ قاری دم بخود رہ جاتا ہے ان کی شاعری انکے وسیع المطالعہ ہونے کے ساتھ ساتھ گہرے

مشاہدے، طویل فنی ریاضت، سماجی شعور اور شعر کے ساتھ انکی لازوال وابستگی کی عکاسی کرتی ہے۔ وہ کائنات کو بہت وسیع نظروں سے دیکھتے ہیں۔ وہ بہت باریک بینی سے اس معاشرے کی حقیقتوں کو دیکھتے ہیں۔ اور مظلوم کی آواز کو قلم کے ذریعے بیان کرتے ہیں۔ان کی شاعری جیتے جاگتے انسانوں کی محرومیوں، آرزوؤں اور جذبوں کی نہایت عمدہ تصویر کشی ہے۔

حوالہ جات

1. Https://ur.m.wikipedia.org.wiki
2. سیّد انصر، برسوں بعد، ارباب ادب پبلی کیشنز، لاہور، 2006ء، ص:65
3. ایضاً، ص:70
4. ریاض مجید، ڈاکٹر، اردو میں نعت گوئی، اقبال اکادمی، پاکستان، 1990ء، ص:24
5. فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو غزل، نعت اور مثنوی، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، 2004ء، ص:267
6. سیّد انصر، برسوں بعد، ص:15
7. خواجہ حضرت علامہ انوار احمد قادری، 92 خطبات، شبیر برادرز، لاہور، 2019ء، ص:325
8. سیّد انصر، برسوں بعد، ص:16
9. ایضاً ص:15
10. ایضاً، ص:17
11. ایضاً، ص:109
12. القرآن، یسین 36، آیت نمبر:36
13. مسلم، الصحیح، 4 : 2044، کتاب القدر، باب حجاج آدم و موسی، رقم:2653
14. صفی حیدر دانش، پروفیسر، سیّد، تصوف اور اردو شاعری، سندھ ساغر اکیڈمی، لاہور، 1948ء، ص:179
15. سیّد انصر، برسوں بعد، ص:101
16. ایضاً، ص:40
17. ایضاً، ص:59
18. آیضا، ص:105
19. ایضا، ص:55

20 ایضاً، ص:90

21 ایضاً، ص:107

22 ایضاً، ص:82

23 القرآن,الحجرات 49,آیت نمبر:12

24 سیّد انصر، برسوں بعد، ص:37

25 ایضاً، ص:38

26 ایضاً، ص:21

27 اسماء مغل، اداس لمحوں کی داستانیں، ادب نامہ، نومبر 2017-18,ص:1

28 سیّد انصر، برسوں بعد، ص:114

29 یوسف حسین خان، ڈاکٹر، اردو غزل، ڈاکٹر بشیر پرنٹر، اردو بازار لاہور، 1952، ص:288

30 سیّد انصر، برسوں بعد، ص:23

31 ایضاً، ص:24

32 ایضاً، ص:34

33 ایضاً، ص:21

34 ایضاً، ص:36

35 ایضاً، ص:54

36 سنبل نگار، اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1995ء، ص:15

37 سیّد انصر، برسوں بعد، ص:111

38 ایضاً، ص:71

39 ایضاً

40 ایضاً، ص:53

41 ایضاً، ص:25

42 ایضاً، ص:83

43 القرآن، سورۃ الزمر 39، آیت:33

44 سیّد انصر، برسوں بعد، ص:32

45 ایضاً، ص:90

46 ایضاً، ص:59

47 ایضاً، ص:42

48 ایضاً، ص:86

49 ایضاً، ص:129

50 علامہ اقبال،ڈاکٹر،ضرب کلیم،اسلام اور مسلمان،حیدر اینڈ سنز، مچھلی کمان حیدر آباد دکن،1936ء،ص:2

51 سیّد انصر، برسوں بعد، ص:46

52 عبد الطیف، مرتب:اقبال(مشمولہ)رسالہ اردو،اقبال نمبر،اکتوبر1938ء،ص:26

53 سیّد انصر، برسوں بعد، ص:60

54 ایضاً، ص:112

55 عبادت بریلوی،ڈاکٹر،اردو تنقید اور حقیقت نگاری،از:رضیہ غفور،بک پیپر ہاؤس،لاہور، 2021،ص:96

56 سیّد انصر، برسوں بعد، ص:83

57 ایضاً، ص:35

58 ایضاً، ص:79

59 ایضاً، ص:56

60 ایضاً، ص:111

61 ایضاً، ص:41

62 ایضاً، ص:34

63 ایضاً، ص:115

64 ایضاً، ص:41

65 ایضاً، ص:49

66 ایضاً، ص:42

67 ایضاً، ص:26

باب پنجم

محاکمہ

فارسی اور اردو شاعری میں غزل کو بہت مقبولیت حاصل ہے۔ دوسری اصناف سخن کے برعکس اردو شاعری میں سب سے زیادہ اشعار غزل میں کہے جاتے ہیں۔ اردو فن ادب میں غزل کی مختلف انداز میں تعریف کی جاتی ہے۔ کبھی غزل کو عورتوں سے باتیں کرنا یا عورتوں کی باتیں کرنا کہا جاتا ہے تو کہیں پہ محبوب کا ذکر اور اس کا احوال بیان کرنا غزل کہلاتا ہے۔ کبھی حسن و عشق کے باہمی معاملات کو بیان کرنے کا نام غزل اور کہیں پہ درد والم کے راگ الاپنے کو غزل کا نام دیا گیا۔ کبھی غزل کو داخلی کیفیات کا نام دیا جاتا ہے جو الفاظ کی شکل میں دل اور روح کو سکون بخشنے کا ذریعہ بنتا ہے اور کہیں پہ غزل کو خارجی کفیات کا نام بھی دیا جاتا ہے جو معاشرتی تبدیلیوں کو جذب کرنے کے بعد رونما ہوتی ہیں۔ دراصل غزل مجموعہ ہے ان تمام عناصر کا جس میں کسی بھی فن کار کی داخلی اور خارجی کیفیات کو الفاظ کے جوڑ توڑ کے ساتھ شاعری کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اردو شاعری کی بنیاد غزل ہے جو اپنی ایک الگ اہمیت رکھتی ہے۔ اردو کے بیشتر شعرا نے اپنے موضوعات میں وسعت اور تنوع کی بنا پر غزل کا انتخاب کیا ہے جس وجہ سے شاعری کا زیادہ تر حصہ اسی صنف میں موجود ہے۔

ابتدا میں غزل کے بنیادی موضوعات حسن اور عشق تھے لیکن دنیا میں ہونے والی سماجی اور معاشرتی تبدیلیوں اور سیاسی انقلاب کی وجہ سے پیدا ہونے والے رجحانات کے ساتھ اس صنف کے موضوعات میں مزید ترقی و تبدیلی ہوتی گئی جس وجہ سے شعرا نے نئے دور اور وقت کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے غزل میں تبدیلیاں کرتے ہوئے اپنے احساسات اور تصورات کو اس انداز میں پیش کیا۔ معاشرتی تبدیلیوں اور انسانی تہذیب و تمدن کی وجہ سے غزل میں نئے رجحانات پیدا ہوتے گئے۔ ہر دور میں ہر شاعر نے اپنی شاعری کا سحر طاری کرنے کی کوشش کی ہے اور ہر ایک نے اپنے انداز میں قارئین اور سامعین کو اپنے اس سحر میں جکڑنے کی کوشش کی ہے۔ کلاسیکی شاعری زیادہ تر حسن و عشق اور ہجر و وصال کے مضامین پر مشتمل تھی جو کہ تین کرداروں محب، محبوب اور رقیب پر مبنی تھی۔

کلاسیکی شاعری میں عشق کا بہترین انداز صوفیانہ نظریات یعنی عشق حقیقی ہے جس میں یہ تصور پایا جاتا ہے کہ اگر دل میں درد اور سوز و گداز نہ ہو تو خدا تک رسائی ناممکن ہے اور خدا دل میں نہیں سما سکتا جس کی وجہ

سے دردو غم اور سوزو گداز کو غزل کا حصہ مانا جاتا ہے۔ معاشرتی تبدیلیوں کی بنا پر ان تصورات میں بھی تبدیلیاں آتی گئیں اور ترقی پسند دور میں غزل کا عاشق بد نصیبی اور درد و گداز کو چھوڑ کر بغاوت اور انقلاب کی طرف مائل ہو گیا۔ ہر تہذیب کا ایک اپنا الگ تصور ہوتا ہے کسی بھی معاشرے میں وقت کی تبدیلی کے ساتھ یہ تصور بھی تبدیل ہوتا جاتا ہے۔ جیسا کہ کلاسیکی تہذیب کا یہ بنیادی تصور مانا جاتا تھا کہ کائنات میں کسی بھی قسم کی تبدیلی میں انسان کی رضا شامل نہیں ہو سکتی جس بنا پر انسان کو مجبور اور تنہا تصور کیا جانے لگا مگر ترقی پسند اور جدید غزل گو شعرا کے کلام میں اس تصور میں تبدیلی پیش عمل ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔

سیّد انصر کا شمار جدید ترقی پسند غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کا تعلق پاکستان کے صوبہ پنجاب کے ضلع گجرات کی تحصیل سرائے عالمگیر کے ایک گاؤں باقر سیداں سے ہے۔ چونکہ شاعری کسی بھی معاشرے کی عکاسی کرتی ہے اور شاعر اس معاشرے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے اثر انداز ہوتا ہے۔ سیّد انصر نے بھی معاشرے میں ہونے والی ان تبدیلیوں کو محسوس کر کے شاعری میں ایک الگ پہچان بنائی ہے اور اپنی شاعری کے ذریعے ارد گرد کے محسوسات کو الفاظ کی صورت میں ڈھال کر صفحہ قرطاس پر بکھیر دیا۔ یوں ان کی شاعری میں ان کی شخصیت کا عکس منعکس ہوتا ہے جو ان کے کردار اور مزاج کی رونمائی کرتی ہے۔

انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم کا آغاز گھر سے کیا پھر انہیں باقاعدہ تعلیم کے لیے گاؤں کے گورنمنٹ سکول میں داخل کروا دیا گیا۔ میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول سرائے عالمگیر سے پندرہ سال کی عمر میں پاس کیا جبکہ چار سال بعد گورنمنٹ ڈگری کالج جہلم سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ انہوں نے کاروبار کے لیے ادویات کا شعبہ اختیار کیا۔

ان کو بچپن سے ہی شاعری سے دلچسپی تھی اور یہ دلچسپی ان کی اردو سے محبت کے سبب تھی۔ شاعری اگر داخلی کیفیات کا نام ہے تو شاعر اپنے جذبات اور خیالات کو لفظوں کی شکل میں بیان کرتا ہے اس طرح ان کی شاعری اس بات کو واضح کرتی ہے کہ کس طرح انہوں نے اپنے خیالات اور جذبات کو شاعری کی صورت میں پیش کیا۔ انہوں نے اپنی داخلی کیفیات کو لفظوں کی شکل دی اور شاعری اس کا عکس بن گیا۔ ان کے خاندان میں شاعری سے کسی کو لگاؤ نہ ہونے کے باوجود انہوں نے اپنی قدرتی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی زندگی میں ادب کو داخل کر کے فنی زندگی کی ابتدا کی۔ ان کی شخصیت سادہ اور بے تکلف ہے جس کا عکس ان کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ ان کے کلام میں سلاست نظر آتی ہے جس کی مثال ان کے اشعار ہیں جو

کہ عام قاری کو بھی سمجھ آجاتے ہیں۔انہوں نے اپنی شاعری میں سچائی اور عصری صداقتوں کو سامنے لانے کی ذمہ داری اٹھائی ہے اور اپنی شاعری کے ذریعے انسانی معاملات کو ایک خوبصورت انداز سے بیان کیا ہے۔

انہوں نے چند احباب کے ساتھ مل کر ایک ادبی تنظیم "ادب دوست" کے نام سے بنائی جس کا مقصد نئے شعرا کو متعارف کروانا تھا اور بعد ازاں یہ تنظیم کچھ وجوہات کی بنا پر دو حصوں میں تقسیم ہوگئی اور ایک نئی تنظیم "کاروان ادب" کی بنیاد رکھی۔ اس میں سید انصر نے بحیثیت صدر خدمات سرانجام دیں اور یہ خدمات اب تک جاری ہیں۔اس تنظیم کے دو معروف شعرا میں شاہد ذکی اور اقبال کوثر کا نام شامل ہے۔

سیّد انصر کا نام آج کے ان ترقی پسند غزل گو شعرا میں شامل ہے جنہوں نے کئی نئے موضوعات کو اپنی شاعری میں بیان کیا ہے۔ دیگر شعرا کی طرح ان کی شاعری بھی عشق و محبت کے موضوع سے شروع ہوئی۔ انہوں نے اپنی ابتدائی شاعری میں حسن و عشق، محبت، جدائی اور غم و درد جیسے موضوعات کو شامل کیا ہے لیکن بعد میں ان کی شاعری میں وسعت پیدا ہوئی اور ان کی شاعری نے انفرادیت سے نکل کر اجتماعیت کا رنگ اختیار کر لیا۔

ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ "دسترس" کے نام سے شائع ہوا جو کہ ان کی شاعری کا بہترین نمونہ ہے۔ اس شعری مجموعہ میں انہوں نے اپنی تمام فنی کاوشوں اور اپنے انداز فکر کو خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ ان کی اس کاوش کو علمی اور ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی ملی۔ انہوں نے اپنی شاعری میں وہ انداز بیان اختیار کیا ہے کہ قاری ان کی سوچ اور انداز میں مگن ہو جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں موجود ترنم نے شاعری کے حسن میں کئی گناہ اضافہ کیا اور ان کا یہ اندازِ بیاں دل و دماغ میں موسیقیت کی وجہ سے خوشگوار احساس چھوڑتا ہے۔ ان کی شاعری بالخصوص غزلیات میں شائستگی، بلند پروازی، ندرت اور بہترین انداز بیان کے ساتھ ساتھ برجستگی بھی پائی جاتی ہے جس سے خوشگوار احساس پیدا ہوتا ہے۔

سیّد انصر کی شاعری کا دوسرا مجموعہ "برسوں بعد" کے نام سے شائع ہوا جو کہ ان کی شاعری میں پختگی کی عمدہ مثال ہے۔ اس شعری مجموعہ میں انہوں نے اپنے شعور کی عظمتوں اور اپنے فن کی تمام کاوشوں کو احسن طریقے سے بیان کیا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں انہوں نے بہت سے متنوع مضامین پر قلم اٹھایا ہے اور تمام روایتی غزل کے عناصر سے ہٹ کر سماجی اور معاشرتی عناصر کا تذکرہ بھی کیا ہے جس سے ان کی غزلوں میں جدیدیت کا رجحان نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں ایسی چیزیں پنہاں ہیں جن کو عیاں کرنے کے لئے بعض اوقات تخیلات کی دنیا میں جانا پڑتا ہے۔ "برسوں بعد" میں بھی انہوں نے شاعری کی کلاسیکی روایات سے ہٹ

کر جدیدیت کا رجحان چھوڑا ہے۔ اس شعری مجموعہ میں انہوں نے جدید شاعری کے بیشتر مضامین کو شامل کیا ہے۔

جب انہوں نے دنیا کو گہری نظروں دیکھنا شروع کیا تو اس میں انہیں بہت سی ایسی سچائیاں نظر آنا شروع ہوئیں جنہیں بدلنا ناممکنات میں سے تھا۔ انہوں نے اس تخیل کو شعری سانچے میں ڈھال دیا۔ ان کی شاعری تصوف کے گرد گھومتی ہوئی نیک و بد، حق و باطل، دنیاوی حقیقتوں، معاشرتی گراوٹ اور وطن پاکستان کی سلامتی کے لیے لوگوں میں امن و امان قائم رکھنے کی تلقین کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان کی غزل تصوف، عشق، محبت، وطن پرستی، امرا کی غفلت، شکوہ، رازداری، غریبوں کا استحصال، خدا کی وحدانیت، معاشرتی خوف جیسے المیے بیان کرتی ہے ان کی شاعری معاشرے کی عکاس ہے اور یہ ان کی شاعری کا حسن بیان ہے۔

ترقی پسند شاعری اور جدیدیت نے ادب کے ہر رنگ پر اپنے اثرات چھوڑے ہیں ایسے ہی شاعری پر بھی اس کا گہرا اثر ہے۔ جدید شاعری میں معاشرتی، سیاسی اور انسانی زندگی کے تمام مسائل کو اجاگر کر کے بیان کیا گیا ہے جس میں ادب برائے زندگی پر بحث کی گئی ہے۔ سیّد انصر نے اپنے تخیلات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ قاری کے ذہن میں ایک تصویر کا عکس بن جاتا ہے اور قاری اس کے سحر میں کھو جاتا ہے۔ ان کی ابتدائی شاعری میں عشق و عاشقی اور سوز و گداز کا رنگ نمایاں ہے۔ ان کی ابتدائی شاعری کی نسبت بعد کی شاعری میں فنی اور فکری پختگی نظر آتی ہے۔ اپنے شعری مجموعات میں انہوں نے اپنی فنی کاوشوں کو بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

ان کی شاعری میں انسانی حالات اور معاملات کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ اس میں انہوں نے معاشرے کی سچی اور کھری صورت دکھائی ہے۔ وہ حقیقت پسند شخص ہیں اور یہ حقیقت ان کی شاعری میں کھل کر سامنے آتی ہے۔ وہ معاشرے کو جیسا محسوس کرتے ہیں اسے اپنی شاعری میں بیان کر دیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں عاجزی و انکساری بھی ہے اور وہ شاعرانہ تعلی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے فن پر نازاں بھی ہیں۔ یہ تعلی محض ان کی شاعرانہ برتری کا اظہار نہیں بلکہ ان کے کلام کی یہ خوبی ان کی شاعری میں واضح نظر آتی ہے۔ وہ کبھی بالواسطہ اور کبھی بلاواسطہ اپنے کلام کی عظمت اور بڑائی بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ کہیں پر وہ خود کو دوسرے شعرا سے ممتاز و منفرد کہتے ہیں اور کہیں پر وہ اس بات پر نازاں ہیں کہ ان کی سوچ اور فکر میں نور اور ضیا ہے اور انہوں نے زمانے کو اپنی شاعری سے بہت کچھ عطا کیا ہے۔ وہ کبھی یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ

ان کی پہچان کے لئے ان کا کلام ہی کافی ہے اور کبھی خود کو شعر گوئی میں خاص مقام و مرتبے کا حامل قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس سب کے باوجود ان میں عاجزی وانکساری کا عنصر واضح ہے۔

ان کے تخلیقی کام میں سماجی محرکات کا بڑا عمل دخل ہے۔ ان کی شاعری فطرت سے قریب تر ہے۔ ان کے ہاں سادگی اور خلوص ہے جو ان کی شاعری کو زندگی کی لہر عطا کرتا ہے۔ ان کا شمار جدید شعرا کی اس صف میں ہوتا ہے جنہوں نے غزل کے قالب میں رہتے ہوئے جدیدیت کو اپنایا۔ در حقیقت جدیدیت سے مراد فقط لفظ بازی نہیں بلکہ ایک نئی اور منفرد سوچ تک قارئین کی رسائی کو ممکن بنانا ہے۔ جدیدیت میں شاعر نہ صرف اچھوتے خیالات پیش کرتا ہے بلکہ اس کا انداز بیان بھی منفرد ہوتا ہے۔ سیّد انصر اس کاوش میں بھر پور کامیاب ہوئے ہیں۔

ان کی غزلیات میں شائستگی، سنجیدگی، برجستگی، بلند پروازی، ندرت اور زبان کی چاشنی پائی جاتی ہے۔ ان کی غزلوں میں حسن و عشق، سوزو گداز، وطن پرستی، احساسِ دین و دنیا، ظلم و جبر، انسان دوستی، خواب، انتظار اور عصر حاضر کے مسائل جیسے موضوعات شامل ہیں۔ ان کی غزلوں میں کلاسکیت کا عکس نمایاں نظر آتا ہے۔ غزل اردو شاعری کی ایک مقبول صنف ہے کوئی دوسری صنف اس کی جگہ نہیں لے سکتی۔ انہوں نے غزلوں کے روایتی موضوعات سے ہٹ کر دوسرے موضوعات کو بھی شامل کیا ہے۔ وہ کسی تصوراتی محبوب کے دلدادہ نہیں بلکہ گوشت پوست کے انسانوں سے محبت کرتے ہیں۔ ایسے خوبصورت انداز سے شعر کہتے ہیں کہ معنی و مفہوم آپس میں الجھتے نہیں۔ جو سوچتے ہیں وہ کہہ دیتے ہیں اور کیا خوب کہہ دیتے ہیں۔ ان کے کلام میں حوصلہ، جدوجہد اور امید کا حسین امتزاج ملتا ہے۔

ان کی شاعری میں ایک ڈرامائی اثر ہے جو قاری کو فوری طور پر متوجہ کر لیتا ہے۔ ان کی شاعری میں آج کا پورا سماج قاری کو اپنے ارد گرد دھڑ اسانس لیتا نظر آتا ہے۔ ان کا ہر شعر ایک منتر کا سحر رکھتا ہے۔ قاری اس کی گرفت میں خود کو بے بس محسوس کرتا ہے اور وہی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے جو شاعر اس سے کروانا چاہتا ہے۔ ان کی شاعری میں ایک تحریک ہے جس سے کچھ کرنے کا جوش و جذبہ ملتا ہے۔

عاشق کی کوئی خواہش نہیں ہوتی۔ یوں کہا جائے تو بہتر ہو گا کہ تمنائیں تو ہوتی ہیں لیکن ان پر اپنا اختیار نہیں ہوتا۔ محبت میں تو عقل کا ساتھ رہتا ہے جبکہ عشق میں عقل سے محرومی ہوتی ہے۔ سیّد انصر پاکیزہ عشق کے قائل ہیں۔ ان کی شاعری میں حسن کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نرم دل انسان عمر کے کسی بھی حصے میں ہو اسے خوبصورتی ضرور متاثر کرتی ہے اور اس کے دل میں محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ انہوں نے بھی

حسن سے متاثر ہوتے ہوئے اس پر قلم آرائی کی ہے۔ معاشرے کا ایک اور خطرناک المیہ منافقت ہے جو معاشرتی بگاڑ کا سبب ہے۔ انہوں نے شاعری میں منافقانہ پن کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ اس سے معاشرے کی حقیقت عیاں ہو سکے۔

خواب و خیال کے انداز کو انہوں نے اپنی شاعری کی زینت بنایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ تصورات کی دنیا میں بیٹھے اپنی تکمیل کی کوشش میں ہیں لیکن یہ سب صرف ایک خیال پر مبنی ہے۔ ان کا دل دہشت گردی جیسے تمام واقعات سے بہت متاثر ہوا ہے جسے وہ اپنی شاعری میں بیان کرتے ہیں۔ غربت جیسا المیہ اس دنیا کا سب سے پریشان کن المیہ ہے انہوں نے اپنی شاعری میں اس کو بھی بیان کیا ہے۔ اس میں جذبہ حب الوطنی بھی بہت نمایاں ہے۔

ان کی شاعری میں سماجی، معاشرتی اور انسانی نفسیاتی معاملات کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں خواہش، شوق، تمنا، لالچ۔، رغبت اور حرص جیسے عناصر کو حصہ بنایا ہے۔ ان کی شاعری معاشرتی مسائل کے ساتھ ساتھ انسانی نفسیات کو بھی واضح کر کے عیاں کرتی ہے۔ لالچ، ہوس اور بے ایمانی جیسے انسانی خیالات ان کی شاعری کا حصہ ہیں۔ انسانی جذبات کے ساتھ کھیلنے والے لوگ اور سیاست کو گندا کرنے والے چند عناصر کو بھی انہوں نے اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔

الغرض انہوں نے اپنی شاعری میں حقیقت پسندی اور سچائی کو بہت نمایاں کیا ہے اور زندگی کے واقعات اور معاملات کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ زندگی میں درپیش معاشرتی مسائل اور اس کے بہاؤ کو نمایاں کرتی ہے۔ مختصراً یہ کہا جائے تو بہتر ہے کہ ان کی شاعری تقریباً تمام فکری اور فنی پہلوؤں کی نمائندگی کرتی ہے۔ ان کی شاعری تخیلات اور حقیقت کے درمیان گھومتی ہے۔ کبھی وہ حقیقت نگاری کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے زندگی کا حقیقی منظر نامہ پیش کیا جا رہا ہو اور کبھی تخیلات کی دنیا میں شاعری کو اس طرح پیش کرتے ہیں جیسے انسان کسی جادو کے زیر اثر آ گیا ہو۔ ان کی شاعری میں خارجی کیفیات کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہے جیسے معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں کی ترجمانی کی گئی ہو۔ اس طرح اس میں داخلی اور خارجی کیفیات کا ذکر ملتا ہے۔ ان کی شاعری کا مرکزی موضوع انسان اور انسانی جہات ہیں۔ وہ معاشرتی گراوٹ اور سیاسی انقلاب کو بھی شاعری کی زینت بناتے ہیں۔ ان کی شاعری میں کلاسیکی موضوعات کے علاوہ انسان اور اس کو درپیش مسائل پر سوچنے کا ذکر ملتا ہے۔ سیّد انصر ادب برائے زندگی کے قائل ہیں اس لیے ان کی شاعری زندگی کے مختلف حقائق پر مبنی ہے۔

کتابیات

بنیادی مآخذ:

1. سیّد انصر، دسترس، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، 2000ء
2. سیّد انصر، برسوں بعد، ارباب ادب پبلی کیشنز، لاہور، 2006ء

ثانوی مآخذ:

- آل احمد سرور ، جدیدیت اور ادب ، (مضمون، جدیدیت کیا ہے: یوسف جمال خواجہ) ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، 1969ء
- احمد حسین مجاہد، رموز شعر، نیسٹ پریس، اسلام آباد، 2017ء
- القرآن، آل عمران 3، آیت 185
- القرآن، البقرہ 2، آیت 154
- القرآن، الحجرات 49 , آیت نمبر 12
- القرآن، الرحمن 55، آیت 26-27
- القرآن، یسین 36، آیت نمبر 36
- القرآن، الزمر 39، آیت 33
- اسماء مغل، اداس لمحوں کی داستانیں، ادب نامہ، نومبر 2017-18
- اکرام، ڈاکٹر، خواجہ، 'اردو کی شعری اصناف' ، شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی
- انوار احمد قادری، خواجہ، حضرت، علامہ، 92 خطبات، شبیر برادرز، لاہور، 2019ء
- جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو (حصہ اول، جلد دوم)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1992ء
- خلیل الرحمن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، 1992ء
- راؤ عبد الستار، مقالہ۔ احمد ساقی بطور شاعر، شعبہ اردو، لیڈز یونیورسٹی، لاہور، 2020ء
- رشید احمد صدیقی، جدید غزل، جامع اردو، علی گڑھ، 1990ء
- رفیع الدین ہاشمی، اصناف ادب، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، 2001ء
- ریاض مجید، ڈاکٹر، اردو میں نعت گوئی، اقبال اکادمی، پاکستان، 1990ء

- زبیر رضوی، نئی نظم تجزیہ اور انتخاب، جی کے آف سیٹ، جامع مسجد، دہلی، 2007ء
- سنبل نگار، اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1995ء
- سیماب اکبر آبادی، دستور اصلاح، مکتبہ قیصر الادب، آگرہ، 1944ء
- شبلی نعمانی، مولانا، شعر العجم، جلد پنجم، مطبوعہ معارف اعظم گڑھ، 1921ء، طبع دوم
- شمس الرحمن فاروقی، اثبات ولی، مکتبہ جامعہ، 1986ء
- شمیم احمد، اردو شاعری کا فن ارتقا، از: ڈاکٹر فرمان فتح پوری، زاہد پرنٹرز، لاہور، 1977ء
- شہزاد منظر، رد عمل، منظر پبلی کیشنز، کراچی، 1985ء
- صفی حیدر دانش، پروفیسر، سید، تصوف اور اردو شاعری، سندھ ساگر اکاڈمی، لاہور، 1948ء
- عبادت بریلوی، ڈاکٹر، شاعری کیا ہے، ادارہ ادب و تنقید لاہور، دسمبر، 1989ء
- عبادت بریلوی، ڈاکٹر، اردو تنقید اور حقیقت نگاری، از: رضیہ غفور، بک پیپر ہاؤس، لاہور، 2021ء
- عبدالقادر غیاث الدین صدیقی، ڈاکٹر، اردو شاعری اور تصوف تاریخی و۔ تنقیدی جائزہ، مطبعہ ابو الوفا الافغانی جامعہ، حیدرآباد، 2009ء
- عبد الطیف، مرتب: اقبال (مشمولہ) رسالہ اردو، اقبال نمبر، اکتوبر 1938ء
- علامہ اقبال، ضرب کلیم، اسلام اور مسلمان، حیدر اینڈ سنز، مچھلی کمان حیدرآباد دکن، 1936ء
- غلام آسی رشیدی، ڈاکٹر، اردو غزل کا تاریخی ارتقا، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 2006ء
- فراق گورکھپوری، من آنم، ادارہ فروغ اردو، لاہور، 1962ء
- فراق گورکھپوری، اردو غزل گوئی، ادارہ فروغ اردو، لاہور، 1995ء
- فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو غزل، نعت اور مثنوی، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، 2004ء
- کوثر مظہری، جواز و انتخاب، 80ء اور بعد کی غزلیں، امکان انٹرنیشنل، نئی دہلی، 2001ء
- مسلم، الصحیح، 4 : 2044، کتاب القدر، باب حجاج آدم و موسی، رقم: 2653
- مظفر حنفی، جدیدیت تجزیہ اور تفہیم، مرتبہ، مضمون بشیر بدر، نسیم بک ڈپو، 1969ء
- مظفر حنفی، جہات و جستجو، مکتبہ جامع دہلی، دہلی، 1982ء
- معین الرحمٰن، ڈاکٹر، جدید اردو غزل، یونیورس بک، لاہور، 1989ء
- ممتاز الحق، ڈاکٹر، اردو غزل کی روایت اور ترقی پسند غزل، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1997ء

- ممتاز بنگلوری، مرتب، طیف غزل، لیکچر از ڈاکٹر سید عبداللہ، لاہور اکیڈمی، لاہور، 1984ء
- یوسف حسین خان، ڈاکٹر، اردو غزل، زاہد بشیر پرنٹرز، اردو بازار، لاہور، طبعِ اول، 1952ء

ویب سائٹس:

- Https://ur.m.wikipedia.org.wi
- https://forum.mohaddis.com>threads2۔

مصاحبات/انٹرویوز:

☆ اقبال ناظر، ہم عصر شاعر، انٹرویو، بمقام کونتریلہ جہلم، 14 مئی 2022ء

☆ امیر حمزہ شاہ، سیّد، بیٹا، انٹرویو، سرائے عالمگیر، گجرات ، 4فروری 2022ء

☆ انصر، سیّد، انٹرویو، سرائے عالمگیر، گجرات، 6فروری 2022ء

☆ بشیر فاطمہ، بہن، انٹرویو، باقر سیّداں، سرائے عالمگیر، 6فروری 2022ء

☆ تسلیم ظہرہ، زوجہ، انٹرویو، سرائے عالمگیر، گجرات، 6فروری 2022ء

☆ صالحہ انصر، بیٹی، انٹرویو، سرائے عالمگیر، گجرات، 19مارچ 2022ء

Nabeela Manzoor Thesis Fall2021

ORIGINALITY REPORT

2%	1%	0%	1%
SIMILARITY INDEX	INTERNET SOURCES	PUBLICATIONS	STUDENT PAPERS

PRIMARY SOURCES

1	Submitted to Higher Education Commission Pakistan Student Paper	1%
2	allamaiqbalpoetrynow.blogspot.com Internet Source	<1%
3	xericarien.blogspot.com Internet Source	<1%
4	imageghazal.blogspot.com Internet Source	<1%
5	napakarmy.wordpress.com Internet Source	<1%
6	debunking-atheism.blogspot.com Internet Source	<1%
7	fundayforum.com Internet Source	<1%
8	urdu.app.com.pk Internet Source	<1%
9	www.khayaban.pk Internet Source	<1%